دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

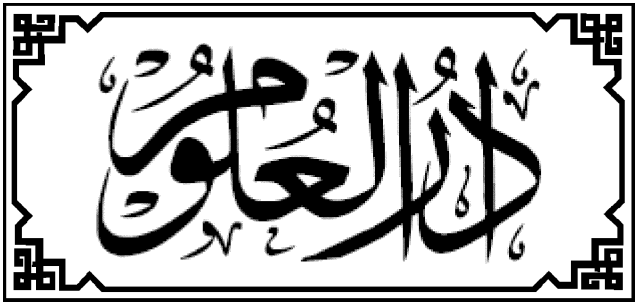

جلد: ۹۵	ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق مارچ ۲۰۱۱ء	شمارہ: ۳

نگراں

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵ روپئے، سالانہ-/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	عہد نبوی کا شہری نظام	اسد اللہ خاں شہیدی	۶
۳	رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک	مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی	۱۷
۴	روشنی کے مینار، قدیم فضلاءِ دیوبند!	ساجد احمد صدوی	۲۹
۵	غلاموں سے متعلق اسلام کے رہنما احکام	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	۴۴
۶	وارداتِ دل	مولانا سعید احمد سرونج قاسمی	۵۶

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اسلامی تاریخ میں ربیع الاوّل وہ مبارک ترین مہینہ ہے، جس میں دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا کا ظہور ہوا، یعنی محسنِ انسانیت پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو خالقِ کائنات نے رحمتِ مجسّم بنا کر اس خاکدان میں بھیجا۔ آپ کی بعثت کے وقت دنیا کا کیا حال تھا ان مختصر صفحات میں اس کا اجمال بھی پیش کرنا ممکن نہیں ہے؛ بس یوں سمجھ لیجیے کہ دین و مذہب، تہذیب وتمدن، معاشرت ومعیشت، اور اخلاق وکردار غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں جہالت وضلالت کا دور دورہ تھا اور انسانیت کی گاڑی اپنی پٹری کو یکسر چھوڑ چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ ظلمت وتاریکی کے ایسے مہیب اور خطرناک غار میں گر جائے، جس سے پھر ابھرنا ممکن نہ ہو۔ ”کُنتُم عَلٰی شَفَا حُفرَةٍ مِنَ النَّارِ“ سے قرآن اسی عالمگیر ابدی تباہی کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

عین اس تباہی وبربادی کے عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑا اور اپنی روشن تعلیمات اور تابناک اخلاق کے ذریعہ دنیا سے نہ صرف کفر وشرک اور ظلم وجہل کی تاریکیوں کو دور کردیا؛ بلکہ لہو ولعب بدعات ورسومات اور بے سروپا خرافات سے مسخ شدہ انسانیت کو اخلاق وشرافت، وقار وتمکنت اور سنت وشریعت کے خوشنما دیدہ زیب زیور سے آراستہ وپیراستہ کردیا۔ اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی شرافت ومروت، عدل وانصاف، علم وحکمت، عبادت واطاعت اور ایمان وایقان کی روشنی نظر آتی ہے، وہ درحقیقت عطیہ ہے، اسی آفتابِ رسالت اور محسنِ انسانیت کا۔

اس رحمتِ مجسم اور محسنِ اعظم کا حق تو یہ تھا کہ ہمارے قلوب ہمہ وقت اس کی عظمت واحترام سے معمور ہوتے اور ہمارے دلوں کی ہر دھڑکن اس کی تعظیم وتوقیر کی ترجمان ہوتی، ہمارا ہر عمل اس

کے اسوۂ حسنہ کا نمونہ، اور ہماری ہر حرکت وسکون اس کی سنتِ مطہرہ کے تابع ہوتی؛ گویا ہماری مکمل زندگی سیرتِ رسول ﷺ کا تذکار اور اخلاقِ نبوی (ﷺ) کی جیتی جاگتی تصویر ہونی چاہیے تھی؛ نہ یہ کہ دیگر اہلِ ادیان ومذاہب کی دیکھا دیکھی ہم بھی اس نبی برحق اور محسنِ اعظم کی یاد وتذکرہ کے لیے چند دن مخصوص کرلیں اور پھر پورے سال بھولے سے بھی اس کی سیرت واخلاق کا ذکر تک زبان پر نہ لائیں، لاریب کہ آپ کا تذکرہ، آپ کی یاد، اور آپ کے فکر میں حیات کے جتنے لمحے بھی گذر جائیں وہ ہمارے لیے سرمایۂ سعادت اور ذریعۂ نجاتِ آخرت ہیں۔

لیکن افسوس وصد افسوس! کہ آج رسولِ عربی فداہ روحی، ابی وامی کے نام لیوا، اور اس کے عشق ومحبت کے دعویدار ''ماہِ ربیع الاوّل'' میں ''عیدِ میلاد النبی'' کے دلنشیں نام پر جو وقتی اور بے روح محفلیں منعقد کرتے ہیں، اس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے اور کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔ آہ! ملتِ اسلامیہ کی یہ کیسی بدبختی وبدنصیبی ہے کہ محسن اعظم ﷺ کے مقدس نام اور سیرتِ پاک کے بابرکت عنوان پر اس ہڑبونگ، غل غپاڑا، شور وشغب اور طوفانِ بے تمیزی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ کچھ دیر کے لیے شیطان کی پیشانی بھی احساسِ ندامت سے عرق آلود ہوجاتی ہے، دل کی دنیا تاریک تر ہوتی جارہی ہے؛ مگر اس کی فکر سے بے پرواہ بازاروں اور گلی کوچوں کو برقی قمقموں سے منور کیا جاتا ہے۔ دل کی بستی ویران اور اجاڑ ہورہی ہے؛ مگر اس کے غم سے غافل راستوں اور چوراہوں کو حسین وخوش منظر جھنڈیوں سے سجایا جاتا ہے۔ چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹے حضور اقدس ﷺ کے نام پر جلسوں اور جلوسوں میں گذار دیا جاتا ہے؛ مگر آں حضرت ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اسلام کے رکنِ اولیں نماز کے تصور تک کو ذہن ودماغ کے دریچے تک آنے نہیں دیا جاتا۔

سیرت کے ان جلسوں اور جلوسوں میں فکرِ ننگ وناموس سے بے نیاز ہوکر مردوں اور عورتوں کا جس طرح اجتماع اور اختلاط ہوتا ہے، عہد جاہلیت کا ''جشنِ نوروز'' بھی اس کے آگے ماند پڑجاتا ہے۔ قوم وملت کا اس قدر سرمایہ ان سطحی اور غیر شرعی مجلسوں کی آرائش وزیبائش میں ہر سال صرف ہوتا ہے کہ اگر اس کا عُشرِ عشیر بھی بیواؤں کی نگہداشت اور بے سہارا بچیوں کے نکاح پر خرچ کردیا جائے تو ملت کی ہزاروں ماؤں اور بہنوں کو اطمینان وسکون اور عزت وآبرو کی زندگی میسر ہوجائے۔

محسنِ کائنات ﷺ کی محبت کے مدعیو! خدارا غور وفکر اور عقل وہوش سے کام لو! وہ دعوی محبت یکسر فریب اور نرا دھوکہ ہے جو اطاعت وتسلیم، جاں سپاری، وخود سپردگی کی عاشقانہ اداؤں سے

خالی ہو۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے:

تَعصي الا لَه وانت تُظهِرُ حبَّهٗ　　هذا محالٌ وفي القياسِ بديعٌ

لو كان حبُّك صادقًا لَأَطَعْتَهٗ　　لِأَنَّ المُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ يُطِيعٌ

تم زبان سے اللہ کی محبت کا اظہار کرتے ہو اور عمل سے اس کی نافرمانی اور مخالفت۔ محبت اور مخالفت کو یکجا ہونا از روئے عقل نہایت عجیب؛ بلکہ محال ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو تم یقینی طور پر اس کی اطاعت کرتے؛ کیونکہ محبّ و عاشق اپنے محبوب کا اطاعت گذار اور فرماں بردار ہوتا ہے۔

تم زبان سے عشقِ رسول ﷺ کا دم بھرتے ہو؛ مگر تمہارے طور طریقے، اخلاق و اعمال اور عادات و خصائل تعلیماتِ رسول اللہ ﷺ اور ہدایاتِ محبوب ﷺ کے سراسر خلاف ہیں۔ ہادیٔ اعظم اور محسنِ انسانیت نے بالکل آخری وقت میں جب کہ نبض ڈوب رہی تھی اور نزع کا عالم طاری تھا، تمہیں نماز کی وصیت فرمائی تھی، غیر محرم عورتوں سے اختلاط تو بڑی دھڑکی بات ہے، ان کی جانب نظر اٹھانے کو بھی آپ ﷺ نے دین و ایمان کی ہلاکت اور تباہی قرار دیا تھا، بیجا اسراف اور فضول خرچی سے تمہیں باز رہنے کی مؤکد ہدایت فرمائی تھی؛ لیکن آج انھیں کے نام پر ان جلسوں اور جلوسوں میں تم وہ سب کچھ کرتے ہو جس سے تمہارے محسن نے تمہیں روکا تھا۔ خدارا ہوش میں آؤ اور دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی تم ہو کہ ان سطحی اجتماعات اور غیر شرعی رسومات میں اپنی طاقت اپنی دولت، اور اپنے وقت کو برباد کر رہے ہو اور اس طرح اپنی دنیا کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی بھی خرید رہے ہو۔

ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستانست

❁ ❁ ❁

عہد نبوی کا شہری نظام

از: اسداللہ خاں شہیدی
شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدینہ منورہ کی شہری ریاست دس برس کے قلیل عرصہ میں ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک عظیم اسلامی ریاست بن گئی، جس کے حدودِ حکمرانی شمال میں عراق وشام کی سرحدوں سے لے کر جنوب میں یمن وحضرموت تک، اور مغرب میں بحرِ قلزم سے لے کر مشرق میں خلیج فارس و سلطنتِ ایران تک وسیع ہوگئیں اور علمی طور سے پورے جزیزہ نمائے عرب پر اسلام کی حکمرانی قائم ہوگئی۔

اگرچہ شروع میں اسلامی ریاست کا نظم ونسق عرب قبائلی روایات پر قائم واستوار تھا تاہم جلد ہی وہ ایک ملک گیر ریاست اور مرکزی حکومت میں تبدیل ہوگئی، یہ عربوں کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی تجربہ تھا؛ کیونکہ قبائلی روایات اور بدوی فطرت کے مطابق وہ مختلف قبائلی، سیاسی اکائیوں میں منقسم رہنے کے عادی تھے، یہ سیاسی اکائیاں آزاد وخود مختار ہوتی تھیں، جو ایک طرف قبائلی آزادی کے تصور کی علمبرداری تھیں تو دوسری طرف سیاسی افراتفری اور اس کے نتیجہ میں تسلسل سیاسی چپقلش، فوجی تصادم اور علاقائی منافرت کی بھی ذمہ دار تھیں، عربوں میں نا صرف مرکزیت کا فقدان تھا؛ بلکہ وہ مرکزی اور قومی حکومت کے تصور سے بھی عاری تھے کہ یہ نظریات ان کی من مانی قبائلی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے، وہ کسی ''غیر'' کی حکمرانی تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے، یہ رسول اکرم ﷺ کا سیاسی معجزہ ہے کہ آپ ﷺ نے دشمن قبائل عرب کو ایک سیسہ پلائی ہوئی قوم میں تبدیل کر دیا اور ان کی ان گنت سیاسی اکائیوں کی جگہ ایک مرکزی حکومت قائم فرمادی، جس کی اطاعت بدوی اور شہری تمام عرب باشندے کرتے تھے، اس کا سب سے بڑا؛ بلکہ واحد سبب یہ تھا کہ اب ''قبیلہ یا خون'' کے بجائے ''اسلام یا دین'' معاشرہ وحکومت کی اساس تھا، اسلامی حکومت کی سیاسی آئیڈیالوجی اب اسلام اور صرف اسلام تھا، جن کو اس سیاسی نصب العین

سے مکمل اتفاق نہیں تھا ان کے لیے بھی بعض اسباب سے اس ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کرنی ضروری تھی۔

اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے جب راہِ ہجرت میں قدم رکھا تو آپ ﷺ کی زبان مبارک پر سورۂ اسرائیل کی ایک آیت کثرت سے رہتی تھی: ترجمہ: ﴿اے اللہ! (نئی منزل میں) صدق وصفا سے داخل کر اور جہاں سے نکالا ہے وہاں کا نکلنا بھی صدق وصفا پر مبنی ہو (نئی جگہ دین پھیلانے کے لیے) غلبہ عطا فرما۔﴾ (سورہ بنی اسرائیل: ۸۰)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی، اسلامی مملکت کے قیام کے لیے آپ ﷺ کو غلبہ عطا فرمایا۔ ابھی آپ ﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں قیام فرما تھے کہ آپ ﷺ نے میثاقِ مدینہ کا اہتمام کیا، اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے مہاجرین، انصار، یہود، عیسائی اور دیگر قبائل کو جمع کیا، آپ ﷺ نے کچھ گفتگو فرمائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے اس موقع پر ایک تحریر لکھوائی، ابتدائی مؤرخین نے اسی کو صحیفہ کا نام دیا ہے، یہ حکمرانِ وقت کا ایک فرمان تھا، ساتھ ہی تمام لوگوں کا اقرار نامہ بھی تھا، جس پر ان لوگوں کے دستخط تھے، اس میں مسلمان اور مشرکین دونوں شریک تھے، ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مدینہ میں ابھی نراج کی کیفیت تھی اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور یہود بنوالنضیر و بنوقریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں تھے، ان میں باہم کئی کئی نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہوکر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان میں مسلسل جنگوں سے اب دونوں تنگ آچکے تھے اور وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے؛ لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا اور ایک بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی تھی کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنادیں؛ حتی کہ بخاری اور ابن ہشام وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہوچکی تھی، بلاشبہ حضور ﷺ نے بیعۃ عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کرکے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے قطع نظر وہاں کے ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سائبان میں اپنے معاملات طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا، تربیت یافتہ مبلغوں کی کوششوں سے تین سال کے اندر شہر میں کچھ لوگ مسلمان ہوچکے تھے؛ مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا، اس کی

سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے، ان حالات میں حضور ﷺ مدینہ آتے ہیں، جہاں اس وقت اور متعدد فوری ضرورتیں تھیں:

۱- اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق وفرائض کا تعین۔

۲- مہاجرینِ مکہ کے قیام اور گزر بسر کا انتظام۔

۳- شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

۴- شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

۵- قریشِ مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی ومالی نقصانات کا بدلہ۔

ان ہی اغراض کے مدنظر حضور ﷺ نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کے چند مہینہ بعد ہی ایک دستاویز مرتب فرمائی، جسے اسی دستاویز میں کتاب وصحیفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جس کے معنی دستور العمل اور فرائض نامہ کے ہیں، اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ شہری ملکیت قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا'' (ڈاکٹر حمید اللہ کی بہترین تحریریں: مرتب قاسم محمود، ص:۲۵۳)

اس میثاق کے بنیادی نکات یہ تھے:

۱- آبادیوں میں امن وامامن قائم رہے گا؛ تاکہ سکون سے نئی نسل کی تربیت کی جاسکے۔

۲- مذہب اور معاش کی آزادی ہوگی۔

۳- فتنہ وفساد کو قوت سے ختم کیا جائے گا۔

۴- بیرونی حملوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے گا۔

۵- حضورِ اکرم ﷺ کی اجازت کے بغیر کوئی جنگ کے لیے نہیں نکلے گا۔

۶- میثاق کے احکام کے بارے میں اختلاف پیدا ہو تو اللہ کے رسول ﷺ سے رجوع کیا جائے گا۔

اس معاہدے میں مسلمانوں، یہودیوں اور مختلف قبیلوں کے لیے، الگ الگ دفعات مرقوم ہیں، یہ اصل میں مدینہ کی شہری مملکت کے نظم ونسق کا ابتدائی ڈھانچہ تھا، یہاں واضح طور پر یہ بات ذہن میں رہے کہ حضور اکرم ﷺ یونان کی شہری ریاستوں کی طرح کوئی محدود ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے؛ بلکہ آپ ﷺ نے ایک عالمگیر مملکت کی بنیاد ڈالی تھی، جو مدینہ کی چند گلیوں سے شروع ہوئی اور روز آنہ ۹۰۰ کلومیٹر کی رفتار سے پھیلتی رہی، اس وقت دس لاکھ مربع میل کی مملکت تھی جب اللہ کے رسول ﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا (محمد رسول اللہ ﷺ: ڈاکٹر حمید اللہ)

اس عالمگیر مملکت کے تصور کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا اور سو برس کے اندر اندر یہ تین براعظموں میں پھیل گئی۔

اس میثاق یعنی صحیفہ میں بلدیاتی نظام کے تعلق سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱- امن وامان کا قیام۔

۲- تعلیم وتربیت کی سہولتیں۔

۳- روزگار، سکونت اور ضروریات زندگی کی فراہمی۔

قرآن حکیم نے بار بار نشاندہی کی ہے کہ انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں اور زمین پر اللہ کا کنبہ ہیں، انسان فطرتاً مل جل کر رہنا چاہتا ہے اور دنیا کے تمام وسائل ہمارے فائدے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے صاف اور سیدھا طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں، فرائض اور حقوق کی ایک بڑی تفصیل ہمارے سامنے ہے، معلم کتاب وحکمت ﷺ ان کی تشریح اور ان کی تفصیل فرماں چکے ہیں۔

ہجرت کے حکم کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سیلاب امڈ پڑا تھا اور آخر کار مدینہ میں مقامی باشندوں کے مقابلہ میں مہاجرین کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ (صحیح بخاری) ان نو واردوں کی آبادکاری کے متعلق حضور پاک ﷺ نے شروع دن ہی سے ایک جامع منصوبہ تیار کرلیا تھا، اس منصوبہ کی جزئیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے نوآبادی (کالونائزیشن) اور شہری منصوبہ بندی (ٹاؤن پلاننگ) میں عظیم انقلاب برپا کردیا تھا، نئے بسنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کو اتنے محدود وسائل میں رہائش اور کام کی فراہمی کوئی آسان معاملہ نہ تھا، پھر مختلف نسلوں، طبقوں، علاقوں اور مختلف معاشرتی وتمدنی پس منظر رکھنے والے لوگ مدینہ میں آآ کر جمع ہورہے تھے، ان سب کو سماجی لحاظ سے اس طرح جذب کرلینا کہ نہ ان میں غریب الدیاری اور بیگانگی کا احساس ابھرے، نہ مدینہ کے ماحول میں کوئی خرابی پیدا ہو اور نہ قانون شکنی اور اخلاقی بے راہ روی کے رجحانات جنم لیں... جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہوتا ہے ....رسول کریم ﷺ کا ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے، جو ماہرینِ عمرانیات کے لیے خاص توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے، جدید شہروں میں آبادی کے دباؤ سے پیدا ہونے والے پیچیدہ تمدنی، سیاسی اور اخلاقی مسائل سے نمٹنے کے لیے سیرت النبی ﷺ سے، ماہرین آج بھی بلاشبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ دنیا کو سب سے پہلے رسالت مآب ﷺ نے اس راز سے آگاہ کیا کہ محض سنگ وخشت کی عمارات کے

درمیان میں کوچہ و بازار بنا دینے کا نام شہری منصوبہ نہیں؛ بلکہ ایسا ہم آہنگ اور صحت مند تمدنی ماحول فراہم کرنا بھی ناگزیر ہے جو جسمانی آسودگی، روحانی بالیدگی، دینی اطمینان اور قلبی سکون عطا کر کے اعلیٰ انسانی اقدار کو جنم دے اور تہذیبِ انسانی کے نشو ونما کا سبب بنے۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد دارالخلافہ کی تعمیر کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب اور اس غرض کے لیے وسیع قطعہ اراضی پہلے ہی حاصل کرلیا گیا تھا، مسجد اور ازواجِ مطہراتؓ کے لیے مکانات بن جانے کے ساتھ دارالخلافہ کی تعمیر کا پہلا مرحلہ تکمیل کو پہنچا، دوسرے مرحلہ کا آغاز نو وارد مہاجرین کی اقامت اور سکونت کے مختصر مکانات (کوارٹرز) کی تعمیر سے کیا گیا؛ یہی وجہ تھی کہ تعمیرات کے اس دو مرحلے و منصوبے پر ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ لگ گیا۔

مدینۃ الرسول، ایک لحاظ سے ''مہاجر بستی'' تھی، گو سارے مہاجر وہاں اقامت نہ رکھتے تھے۔ (طبقات ابن سعد) ہوسکتا ہے جب مدینہ کی آبادی بڑھی ہو تو مکانات اور تعمیرات کا سلسلہ پھیل کر عہدِ رسالت مآب ﷺ ہی میں قریب کی آبادیوں بنی ساعدہ، بنی النجار وغیرہ سے مل گیا ہو، ورنہ ریاست کی پالیسی یہ تھی کہ مدینہ کی کالونی میں صرف مہاجرین کو بسایا جائے، عوالی میں رہنے والے بنوسلمہ نے جب مدینہ آکر آباد ہونے کی درخواست کی تو آپ نے اسے نامنظور کردیا اور انھیں اپنے قریہ ہی میں رہنے کی ہدایت کی، ریاست کی نوآبادی اسکیم کا یہ بھی ایک اہم حصہ تھا کہ اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ کر مدینہ آنے والے لٹے پٹے، بے سروسامان اور بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلوں کو جائے رہائش سرکاری طور پر فراہم کی جائے؛ بلکہ ان نو واردوں کو سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرایا جاتا اور ان کے کھانے اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا جاتا، بعد میں ان لوگوں کو مستقل رہائش کے لیے جگہ یا مکان مہیا کرنا بھی حکومت کا فرض تھا گویا مہاجرین کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی اسلامی حکومت کی ذمہ داری تھی۔

مہاجرین کی عارضی رہائش کا انتظام مسجد کے اندر کیمپ لگا کر یا صفہ میں کیا جاتا، اگر مہاجرین کی تعداد زیادہ ہوتی یا قافلہ پورے قبیلہ پر مشتمل ہوتا تو انھیں عموماً شہر کے باہر خیموں میں ٹھہرایا جاتا؛ تا آں کہ مستقل رہائش کا معقول انتظام نہ ہوجاتا، آبادکاری کے دو طریقے اختیار کیے گئے اولاً یا تو کسی ذی ثروت انصاری مسلمان کو کہہ دیا جاتا کہ وہ ایک مہاجر کی رہائش کا اپنے ہاں انتظام کرلیں؛ مگر خیال رہے کہ صرف شروع کے ایام میں ایسا کیا گیا جبکہ اسلامی ریاست صحیح طرح صورت پذیر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی منظم تھی۔

مہاجروں کو ٹھہرانے کے لیے عموماً بڑے بڑے مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ مکانات کئی کمروں پر مشتمل تھے، ایک کمرہ ایک خاندان کو دیا جاتا؛ البتہ ایسے مکانات میں باورچی خانہ وغیرہ مشترکہ ہوتا، اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ کی کالونی میں سرکاری طور پر علحدہ رہائش کے لیے جو مکانات بنوائے وہ تین کمروں کے تھے، (ماخوذ از ادب المفرد: امام بخاری)

توسیعِ شہر:

تعمیرات کا سلسلہ ایک عرصہ تک تواتر کے ساتھ جاری رہا، یہاں تک کہ بنی قینقاع کے اخراج (۳ھ) کے بعد مکانات کی خاصی تعداد مسلمانوں کے ہاتھ آجانے کے سبب رہائشی قلت بہت حد تک دور ہوگئی، مگر یہ مسئلہ ختم نہ ہوا؛ کیوں کہ رہائشی سہولتوں کے مقابلہ میں نو واردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا؛ اس لیے ۵ھ (بنو قریضہ کی فتح) تک یہ مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا، اس کے بعد اسلامی حکومت کی آمدنی کے وسائل بھی پیدا ہوگئے، مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی کسی قدر سنبھل گئی، یہودیوں کے بہت سے مکانات بھی مل گئے، لہٰذا معاملہ کی سنگینی بڑی حد تک کم ہوگئی؛ تاہم آبادکاری کا کام فتحِ مکہ اور اس کے بعد بھی جاری رہا، فتح کے ساتھ ہی چونکہ ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا، اس لیے مدینہ میں مہاجرین کی آمد کا سلسلہ رک گیا؛ تاہم کئی لوگ فتحِ مکہ کے بعد بھی مدینہ میں آکر آباد ہوئے اور حصولِ تعلیم وغیرہ کے لیے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہا (عہد نبوی کا نظام تعلیم: ڈاکٹر حمید اللہ)

عہد نبوی ﷺ کے اواخر میں مدینہ کا شہر مغرب میں بطحا تک، مشرق میں بقیع الغرقد تک، اور شمال مشرق میں بنی ساعدہ کے مکانات تک پھیل چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اب وہاں مزید مکانات تعمیر کرنے سے روک دیا، شہری منصوبہ بندی کے ضمن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام زبردست اہمیت کا حامل ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جنھیں جدید صنعتی شہروں کے اخلاق باختہ اور انتشار انگیز معاشرہ کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہرِ نو (مدینہ) کو ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہونے دیا، اور اس شہر کی زیادہ سے زیادہ حد (۵۰۰) پانچ سو ہاتھ مقرر کی، اور فرمایا کہ شہر کی آبادی اس حد سے بڑھ جائے تو نیا شہر بسائیں اور آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں بھی اس اصول پر عمل کرتے ہوئے دو اقدام کیے، ایک یہ کہ اضافی آبادی کو یا تو اور زمینوں میں منتقل کرنے کا حکم جاری کیا، تاکہ اس طرح ایک طرف زرعی انقلاب

برپا کیا جاسکے اور دوسری طرف نئے لوگوں کی رہائش کے لیے گنجائش نکالی جاسکے، دوسری طرف یہ کہ قریظہ اور نضیر کی مفتوحہ بستیوں یا جوف مدینہ کے دیگر قریوں میں پھیلا دیا؛ تاکہ ایک جانب معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہونے کے امکانات ختم ہوجائیں اور دوسری طرف صحت منداور تعصّبات سے پاک معاشرہ تخلیق کیا جاسکے، اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی (نسائی، کتاب الصلاۃ)

آج کل کچھ مغربی ممالک میں ٹاؤن پلاننگ کے انھیں ذریں اصولوں پر جنھیں رسول اللہ ﷺ نے چودہ سوسال پہلے آزمایا تھا، عمل کرکے معاشرتی ہیجان اور تہذیبی انتشار کی شدت کو کم کرنے میں، ایک حدتک کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں۔

مدینہ کی شہری ریاست:

موجودہ دور میں شہری حکومت کے مقاصد کچھ اس طرح ہوتے ہیں:

۱- شہر کی گلیوں اور شاہ راہوں کا بندوبست، مارکیٹوں کی تعمیر، رہائشی انتظامات۔

۲- پینے کے پانی کی فراہمی اور تقسیم۔

۳- گندے پانی کی نکاسی، کوڑے کرکٹ کے پھینکوانے کا بندوبست۔

۴- تعلیم، علاج، دیگر فلاحی ادارں، کھیل کے میدانوں کا قیام۔

۵- چمن بندی اور شہر کی خوبصورتی اور تفریح گاہوں کا انتظام۔

۶- ان کاموں کے لیے مالی وسائل اور کاموں کا احتساب۔

حضور پاک ﷺ کی احادیث سے ہمیں بلدیاتی نظام کے بہت سے اصول ملتے ہیں، جہاں تک محکمۂ احتساب کا تعلق ہے، فارابی، ماوردی اور اور طوسی اسی کی موافقت میں ہیں؛ ماوردی نے محکمۂ احتساب کی خصوصیات کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ محکمۂ انصاف اور محکمۂ پولیس کے درمیان ایک محکمہ ہے، محتسب کا فریضہ یہ ہے کہ اچھے کام جاری کرے اور برے کاموں کو روکے۔

قرآنی اصطلاح معروف کی تین قسمیں ہیں:

۱-حقوق اللہ ۲-حقوق العباد ۳-وہ اعمال وہ افعال جن کا تعلق دونوں سے ہو۔

مدینۃ النبی ﷺ میں یہ کام اللہ کے رسول ﷺ خود انجام دیتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ مدینہ کے بازاروں میں نکلتے تو جگہ جگہ رک کر، ناپ تول کر، پیمانہ دیکھتے، چیزوں میں ملاوٹ کا پتہ

لگاتے، عیب دار مال کی چھان بین کرتے، گراں فروشی سے روکتے، استعمال کی چیزوں کی مصنوعی قلت کا انسداد کرتے؛ اس ضمن میں سیدنا حضرت عمرؓ، حضرت عبیدہ بن رفاعہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابوامامہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی بیان کردہ حدیثیں اصولوں کی تعین کرتی ہیں۔

بلدیاتی نظام میں سب سے اہم سڑکوں، پلوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کے علاوہ نئی شاہ راہوں کی تعمیر اور آئندہ کے لیے ان کی منصوبہ بندی کا کام ہوتا ہے۔ بعض لوگ ذاتی اغراض کے لیے سڑکوں کو گھیر لیتے ہیں، بعض مستقل طور پر دیواریں کھڑی کر لیتے ہیں، فقہِ اسلامی میں اس کے بارے میں واضح احکام ملتے ہیں؛ صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ''اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم راستے میں اختلاف کرو تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ ہوگی، اس سے کم گلی بھی نہیں ہوسکتی۔'' (صحیح مسلم)

حضور اکرم ﷺ نے سڑکوں پر گندگی ڈالنے سے روکا ہے، آپ ﷺ نے سڑکوں پر سے رکاوٹ کی چھوٹی موٹی چیز کو ہٹا دینے کو صدقہ قرار دیا ہے، سڑکوں پر سایہ دار درخت لگانے کا حکم ہے۔ ابواللیث سمرقندیؒ اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں کہ ''کسی سمجھ دار آدمی کے لیے یہ بات زیبا نہیں کہ وہ راستہ پر تھوکے یا ناک صاف کرے، یا کوئی ایسا کام کرے، جس سے سڑک پر پیدل چلنے والے کے پاؤں خراب ہوجائیں، اسلام کا قانون حق آسائش اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ سڑک پر کوئی عمارت بنائی جائے''

موجودہ دور میں ایک اہم مسئلہ ٹرافک کا ہے، اس کے بارے میں تعلیماتِ نبوی ﷺ سے احکام ملتے ہیں، سڑکوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے اور راستہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے، آپ ﷺ نے جانوروں تک کے لیے راستہ کی آزادی برقرار رکھی ہے، مدینہ کی شہری مملکت میں پینے کے پانی کا انتظام یہودیوں سے کنوئیں خرید کر کیا گیا، قبل از اسلام مدینہ کی گلیوں میں گندے پانی کی نکاسی کا انتظام نہ تھا، بیت الخلاء کا اس زمانہ میں رواج نہ تھا؛ لیکن مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے جب شہروں کی آبادی بڑھنے لگی تو پھر ان مسائل کا حل تلاش کیا گیا۔

شہر میں پینے کے پانی کی بہم رسائی کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا، مدینہ میں پینے کے لیے میٹھے پانی کے کنوئیں اور چشمے بمشکل دستیاب ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے جو خود بھی مدینہ کی نو آبادی

میں رہتے تھے، آں حضور ﷺ کے حکم کے مطابق اہلِ مدینہ کے لیے یہودیوں سے میٹھے پانی کا کنواں بئر روماں خرید کر وقف کر دیا۔ (صحیح بخاری باب فضائل)

اسلام جسم و جان کی پاکیزگی اور ظاہر و باطن کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے، وضو، طہارت، غسل کے احکامات اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آپ ﷺ نے مسجدیں بنا کر وہاں طہارت خانہ تعمیر کرنے کی ہدایت جاری کی، اسلام کے عمومی مزاج اور آپ ﷺ کے اس فرمان کے بعد گھر گھر غسل خانے بن گئے۔ ہر مسجد کے ساتھ طہارت خانہ تعمیر کیے گئے۔ (ابن ماجہ)

ہم سایہ کے حقوق کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کے جو ارشادات ملتے ہیں، ان پر عمل درآمد سے انسانی معاشرہ کے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں، صحیح مسلم میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے ''کوئی مسلمان، مسلمان نہیں ہے، جب تک وہ اپنے ہمسائے کے لیے وہی بھلائی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔''

اس ایک ارشادِ مقدس میں صفائی ستھرائی، صحت، شائستگی، خوش خلقی، صلح جوئی، ہمدری، ایثار اتنی ساری باتیں آتی ہیں کہ شہری زندگی کے تمام ضوابط کی عمدگی سے پابندی ہو سکتی ہے۔

ہجرت سے قبل مدینہ میں ناجائز تصرفات عام تھے، رسول اکرم ﷺ نے اسے سختی سے منع فرما دیا، گلی یا کوچہ کی کم سے کم چوڑائی جھگڑا ہو جانے کی صورت میں سات ہاتھ ''ذراع'' مقرر کی گئی۔ (صحیح مسلم) جوفِ مدینہ کی آبادیوں میں گلیاں عام طور پر تنگ ہوتی تھیں، اس لیے مدینہ میں بھی کوچہ تنگ، مگر سیدھے تھے، باوجود یہ کہ آپ ﷺ کا اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مکانات مختصر تھے، مگر عام طور پر آپ ﷺ نے کشادہ مکانات کو پسند کیا اور فرمایا ''خوش بخت ہے وہ شخص جس کی جائے رہائش وسیع اور پڑوسی نیک ہوں'' (امام بخاری۔ باب ادب المفرد)

حفظانِ صحت کا خیال رکھنا اسلامی زندگی کا بنیادی نظریہ ہے، صفائی اور پاکیزگی کو اسلام نے نصف ایمان کا درجہ دیا ہے، گھر، گھر کے باہر کا ہر مقام، اپنے جسم، اپنے کپڑوں کی پاکی کا حکم بار بار آیا ہے، مسجدوں کو پاکیزگی کے نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، سرکاری عمارتوں کو پاک صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بدوی مسجد بنوی کی دیواروں پر تھوک دیتے تو اللہ کے رسول ﷺ اپنے ہاتھوں سے اس جگہ کو صاف کرتے تھے، وضو اور غسل کا نظام، غلاظت سے صفائی کے احکام، چوپال، کھلیانوں کی جگہ، دریاؤں کے کنارے اور تفریح کے مقامات کو پاک صاف رکھنا حفظانِ صحت کے اصول کے مطابق بھی ہے اور اس میں شائستگی کا اظہار بھی ہے۔

حفظانِ صحت ہی کے اصول کے تحت بلدیاتی نظام میں کھانے پینے کی چیزوں کے خالص ہونے پر زور دیا گیا ہے، ملاوٹ کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں اور عذاب کی وعید ہے، پینے کے پانی کو صاف رکھنے اور گندے پانی کی نکاسی کے احکام بھی اسی عنوان کے تحت آتے ہیں، اسی عنوان سے متعلق بیماریوں کے علاج کی سہولتیں بھی ہیں، ان میں وباؤں کے خلاف حفاظتی تدابیر اور ہر وقت ان کے انسداد کی ذمہ داری شہری حکومت پر ہے۔

سایہ، چمن بندی، عوامی تفریح گاہوں کا انتظام بھی عین اسلامی تعلیم کے مطابق ہے، مثلاً سورۂ عبس میں ارشاد ربانی ہے کہ ''ہم نے زمین سے اناج اگایا اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا، یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لیے بنایا ہے'' (سورۂ عبس آیت: ۳۲۔۲۷)

ہجرت کے وقت مدینہ باغوں کی سرزمین کہلاتا تھا، اور یہاں کے لوگ باغات کے بہت شوقین تھے، رسول ﷺ نے شہر اور مسجد کی تعمیر کے وقت یہ کوشش کی کہ وہاں موجود کھجور کے درختوں کو کم سے کم نقصان پہنچے، مسجد النبی ﷺ کے دروازہ کے قریب کھجور کے درختوں کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے، جہاں غسل خانہ اور طہارت خانہ بھی تھا اور کنواں بھی اسی جگہ تھا، مسجد النبی ﷺ کے بڑے دروازہ کے بالمقابل حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا وسیع وشاداب باغ بیرحاء تھا، جہاں حضور پاک ﷺ اکثر تشریف لے جاتے۔ (صحیح بخاری، نسائی، ابن ماجہ)

مدینہ میں نکاسیِ آب کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا؛ کیوں کہ شہر اونچی ڈھلوانی جگہ پر تھا، اکثر کہیں سے کوئی پہاڑی ندی، نالہ گذرتا تھا تو وہاں باندھ کے ذریعہ عمارات اور تعمیرات کو محفوظ بنادیا گیا تھا۔

ہجرت کے بعد مدینہ میں خرید وفروخت کی سہولت کے لیے علاحدہ منڈی یا بازار بنادیا گیا، خیال یہ ہے کہ یہ منڈی بنوقینقاع کے اخراج (۳ھ) کے بعد قائم ہوئی ہوگی؛ کیونکہ اس سے پیشتر عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور دوسرے تجارت پیشہ مسلمان اپنا کاروبار قینقاع کے بازار میں کرتے تھے۔ (صحیح مسلم)

مدینے کا بازار مسجد النبی ﷺ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، بازار خاصہ وسیع وعریض تھا اور آخر عہد بنوی میں نہایت بارونق اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا، تجارت کے فروغ کے لیے جناب رسالت مآب ﷺ نے زبردست کوششیں کی، جن میں سب سے اہم آپ ﷺ کا یہ فرمان

تھا۔ ’’مدینہ کی منڈی میں کوئی خراج نہیں ہے‘‘ (فتوح البلدان، بلاذری)

زمانۂ جاہلیت میں خفارہ کا نظام اور قدم قدم پر محصول چنگی کی وجہ سے تجات میں بڑی رکاوٹیں تھیں، آپ ﷺ نے مختلف سیاسی اور عسکری مصالح کے پیش نظر یہ حکم صادر فرمایا جو دوررس نتائج کا سبب تھا، اور دراصل اس طرح آپ ﷺ نے چنگی کی لعنت ہی ختم نہ کی؛ بلکہ جزیرۃ العرب کی تسخیر کے بعد تمام ملک میں، مدینہ کی طرح آزادانہ درآمدات اور برآمدات کی اجازت دے کر بین الاقوامی آزاد تجارت کی داغ بیل ڈالی اور جدید تحقیقات نے اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کردیا ہے کہ آزاد بین الاقوامی تجارت نہ صرف اقوام وملل کے لیے، بلکہ پوری نوعِ بشر کی مادی ترقی کے لیے ضروری ہے، جس کے ذریعہ بین الاقوامی طور پر اشیاء کی قیمتیں متوازن رکھ کر عوام کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اس طرح اقوام خوشحال بن سکتی ہیں۔

تعلیمی اداروں کا قیام:

حضور پاک ﷺ نے منجملہ ان باتوں کے تعلیم پر بڑا زور دیا ہے، تاریخِ اسلام میں پہلا نصابِ تعلیم رسول اللہ ﷺ نے ہی ترتیب دیا، اللہ کے رسول ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ایک چبوترہ بنا کر اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی؛ جہاں آپ ﷺ خود درس دیا کرتے تھے، اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ نے مسجد میں مکتب قائم کرکے ان کی نگہداشت واخراجات کا ذمہ دار بھی حکومت کو بنایا، آج دورِ جدید میں شہری حکومت کی ذمہ داریوں میں تعلیم کی اشاعت اور فنون کی تربیت بھی شامل ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ علم انبیاء کا ورثہ ہے، مسلمان کو چاہئے کہ جہاں سے ملے لے لے۔

❁ ❁ ❁

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک

از: مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن

(آج کل بعض اشخاص کا کہنا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے بطورِ تبرک جو موئے مبارک ان کے پاس ہیں، وہ بڑھتے اور زیادہ ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں زیرِنظر مضمون تحریر کیا گیا ہے)

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر میں منیٰ میں تشریف لاکر جمرۂ عقبہ کی رمی کے بعد اونٹوں کی قربانی کی، اس کے بعد مشہور اور صحیح قول کے مطابق معمر بن عبداللہ العدوی رضی اللہ عنہ سے اپنے سرِ مبارک کا حلق کرایا، پھر موئے مبارک تقسیم فرمائے، ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں ہے:

عن ابن مالك؛ أن رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أَتٰى مِنٰى. فأتٰى الجمرةَ فرماها. ثم أتٰى منزلَهٗ بِمنٰى ونَحَرَ. ثم قال للحلّاق: خذ وأشارَ إلى جانِبِهِ الأيمنِ. ثم الأيسرِ. ثم جَعَلَ يُعطِيهِ الناسَ. (صحيح مسلم بشرح النووي، ص:٤٥، ج:٩ كتاب الحج، باب بيان أن السنة يوم النحر أن يرمي الخ)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منیٰ آمد کے بعد جمرہ کے پاس تشریف لاکر، اس کی رمی کی، پھر منیٰ میں اپنی اقامت گاہ تشریف لائے اور قربانی کی۔ پھر حلاق سے فرمایا: لو، اور اپنے سر مبارک کی دائیں جانب اشارہ فرمایا۔ پھر (اسی طرح) بائیں جانب۔ پھر وہ موئے مبارک (حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے) لوگوں کو دینے لگے۔''

عن انس بن مالك؛ أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم رمٰى جمرةَ العقبةِ. ثم انصرفَ الٰى البُدن فَنَحَرَها والحجامُ جالسٌ، وقال بيدهٖ عن رأسِهٖ، فحَلَقَ شِقَّهُ الأيمنَ. فقَسَّمهُ فِيمَنْ يَليهِ. ثم قال: أحلِقُ الشِّقَّ الاٰخَرَ. فقال: أينَ أبوطلحةَ؟ فأعطاهُ ايَّاهُ. (صحيح مسلم بشرح النووي، ص:٤٦، ج:٩ كتاب الحج، باب بيان أن السنة يوم

النحر أن يرمي الخ)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے جمرۂ عقبہ کی رمی کی، پھر اونٹوں کی طرف تشریف لے گئے اور ان کا نحر کیا، حجام صحابی بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے اپنے دستِ مبارک سے سر (کی دائیں جانب حلق) کے لیے اشارہ فرمایا، تو انھوں نے آپ کے سرِ مبارک کی دائیں جانب حلق کیا، آپ نے ان بالوں کو اپنے قریب لوگوں میں (حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے) تقسیم فرمایا، پھر حجام صحابی سے فرمایا: دوسری جانب حلق کرو۔ (انھوں نے بائیں جانب حلق کیا) پھر آپ نے دریافت فرمایا: ابوطلحہ کہاں ہیں؟ (حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے) پس آپ نے وہ موئے مبارک ان کو دیئے۔''

صحیح بخاری میں ہے:

عن انسٍؓ؛ أن رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما حَلَقَ رأسَہ کان ابوطلحةَ اوّلُ من اَخَذَ من شعرِہ. (صحیح بخاری، ص:۲۹، ج:۱ کتاب الوضوء، باب الماء الذي یغسل بہ شعر الانسان)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے سرِ مبارک کا حلق کرایا، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے موئے مبارک لینے والوں میں اوّل تھے۔''

اس امر میں روایات مختلف ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے سرِ مبارک کی دائیں جانب کے موئے مبارک دیئے تھے یا بائیں جانب کے؟ شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''زاد المعاد'' (ص:۲۵۳، ۲۵۴ دارالکتب العلمیہ۔ سن طباعت: ۲۰۰۷ء) میں اس پر قدرے تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں جانبوں کے بال حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیئے تھے، پھر دائیں جانب کے بال حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے حکم سے لوگوں میں تقسیم کردیئے تھے اور بائیں جانب کے بال آپ ہی کے حکم سے اپنی اہلیہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا کو دے دیئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''الاصابۃ'' میں ''حضرت جُعشم الخیر رضی اللہ عنہ'' کے تعارف میں فرماتے ہیں:

وجُعشم الخیر (رضی اللّٰہ عنہ) بایع تحت الشجرة، وکساہ النبی صلی اللّٰہ

عليه وسلم قميصَه ونعلَيهِ، وأعطاهُ مِن شعرهِ (صلى اللّٰه عليه وسلم). (الاصابة في تمييز الصحابة، ص:٢٣٦، ج:١)

''حضرت جُعشم الخیر رضی اللہ عنہ نے (حدیبیہ میں) درخت کے نیچے (رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر) بیعت کی، اور نبی ﷺ نے ان کو اپنا کرتا مبارک، نعلینِ مبارک اور اپنے کچھ موئے مبارک عنایت فرمائے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک تقسیم فرمانے کا راز

رسول اللہ ﷺ نے اپنے موئے مبارک حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں کیوں تقسیم فرمائے تھے؟ اس سلسلہ میں علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَاِنّما قسَّم شعرَه في اصحابه لِيكونَ بركةً باقيةً بينَهم وتذكرةً لهم، وكأنَّه أشارَ بذلك إلى اقترابِ الأجل. (شرح العلامة الزرقاني على المواهب اللدنية، ص:١٩٦، ج:٨، دارالمعرفة، بيروت)

''رسول اللہ ﷺ نے اپنے موئے مبارک اپنے اصحاب میں اس لیے تقسیم فرمائے، تاکہ وہ ان میں بطور برکت اور یادگار رہیں اور اسی سے گویا آپ ﷺ نے قربِ وصال کی طرف اشارہ فرمادیا۔''

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

حضور ﷺ کا اپنا بالِ مبارک تقسیم کرنا، اپنی تعظیم وعبادت کے لیے نہ تھا؛ بلکہ صحابہؓ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع وقتال کے رفع دفع کرنے کے لیے تھا، اگر آپ ﷺ اپنے بالوں کو دفن کراتے، تو یقیناً صحابہؓ زمین سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے، اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آجاتی۔ (ملفوظات حکیم الامت، ص:۱۷۱، ج:۲۳، ملفوظ:۵۰۱)

موئے مبارک کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کا معاملہ

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حجۃ الوداع یا کسی عمرہ میں حلق کے موقع پر یا عام حالات میں بال تراشنے کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک حاصل ہوئے، تو انھوں نے ان کو بحفاظت رکھا، اور ان سے برکت حاصل کرتے رہے۔

حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے عمرہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے حاصل ہونے والے موئے مبارک اپنی ٹوپی میں سی کر رکھ دیئے تھے، ان کی برکت سے جنگ میں کامیابی ان کے قدم چومتی تھی، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قد ذَكَرَ غيرُ واحدٍ أن خالدَ بنَ الوليدِ رضى اللّٰه عنه كانَ في قلنسوته شعراتٌ من شعرهٖ صلى اللّٰه عليه وسلم فلذلك كان لا يقدم علٰى وجه الّا فتح له. (عمدة القاري، ص:٦٣، ج:١٠)

''کئی حضرات نے ذکر کیا ہے کہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک میں سے کچھ موئے مبارک تھے، اسی وجہ سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جس جانب پیش قدمی فرماتے تھے، اُنھیں کامیابی حاصل ہوتی تھی۔''

''مجمع الزوائد'' میں ہے:

عن جعفر بن عبد اللّٰه بن الحكم؛ أن خالدَ بنَ الوليدِ فَقَدَ قلنسوةً له يومَ اليرموكِ. فقال: اُطْلُبوها، فلم يَجِدُوها. فقال: اُطْلُبوها، فوَجَدُوها، فإذا هي قلنسوةٌ خَلِقَةٌ، فقال خالد: اعتمر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فحَلَقَ رأسَه، فابتدَرَ الناسُ جوانبَ شعرهٖ، فسبقتُم الٰى ناصِيَتِه، فجعلتُها في هذه القلنسوةِ، فلم أشْهَدْ قتالا وهي معي إلّا رُزقتُ النصرةَ.

قال الحافظ الهيثميُّ: رواه الطبراني وأبو يعلٰى بنحوهٖ، ورجالُهما رجالُ الصحيح، وجعفر سَمِعَ من جماعةٍ من الصحابةِ، فلا أدري سمع من خالدٍ أم لا. (مجمع الزوائد، ص:٤٣٠، ٤٣١، ج:٩، حديث: ١٥٨٨٢)

''جعفر بن عبداللہ بن الحکم سے مروی ہے، کہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی جنگِ یرموک کے موقع پر گم ہوگئی، اُنھوں نے لوگوں سے فرمایا: اسے تلاش کرو! لوگوں نے تلاش کرنے پر نہیں پائی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دوبارہ تلاش کرنے کا حکم فرمایا، اب کی بار لوگوں نے پالی، لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایک بوسیدہ ٹوپی ہے۔ (اس کے باوجود جس اہتمام سے اسے تلاش کیا، کروایا، اس پر لوگوں کو تعجب ہوا، تو ان کے تعجب وحیرت کو ختم کرنے کے لیے) حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے عمرہ ادا فرمایا، اس کے بعد اپنے سرِ مبارک کا حلق کرایا، تو لوگ آپ کے سرِ مبارک کی مختلف جانبوں کے موئے مبارک کی طرف سبقت کی غرض

سے بڑھے، پس میں نے آپ کے سرمبارک کے سامنے کی جانب کے بالوں کے لیے ان سب سے سبقت حاصل کرلی۔ پھر میں نے وہ موئے مبارک اس ٹوپی میں رکھ دیے، اس ٹوپی کے ساتھ جس جنگ میں شریک ہوا، اس میں مجھے کامیابی ہی ملی۔''

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ، الشفاء میں فرماتے ہیں:

كانتُ في قلنسوةِ خالد بنِ الوليدِ شعراتٌ من شعرهِ صلى اللّٰه عليه وسلم، فسقطَتْ قلنسوتُهٗ فى بعض حروبهٖ، فشدَّ عليها شدةً انكر عليه أصحابُ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لكثرةٍ من قتلٍ فيها، فقال: لم اَفعَلُها بسببِ القلنسوة. بل لما تضمنته من شعره صلى اللّٰه عليه وسلم، لئلا اسلب (وفى نسخة: تسلب) بركتَها وتقع في أيدى المشركين. (الشفاء مع شرحه نسيم الرياض، ص:٤٣٤، ج:٣)

''حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک میں سے کچھ موئے مبارک تھے۔ ایک جنگ میں آپ کی ٹوپی گرگئی، تو اس کے لیے انھوں نے سخت حملہ کیا، (جو) نبی ﷺ کے اصحاب (کو غیر معمولی معلوم ہوا، اس لیے انھوں) نے ان پر نکیر کی؛ کیوں کہ اس حملہ میں بہت آدمی قتل ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ میں نے یہ حملہ ٹوپی کی وجہ سے نہیں کیا؛ بلکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک تھے، ان کی وجہ سے کیا تھا، کہ مبادا کہیں میں ان کی برکت سے محروم نہ ہوجاؤں اور یہ مبارک بال مشرکین کے ہاتھ میں پہنچ جائیں۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے، کہ آپ نے مرضِ وفات میں اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور فرمایا:

يا بنيّ؛ انى صَحِبْتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فخَرَجَ لحاجةٍ، فاتَّبعتُه بإداوة، فكساني أحدَ ثوبيه الذى كان على جلده، فخبأته لهذا اليوم، وأخذَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من اظفارهٖ وشعرهٖ ذاتَ يوم فأخذتُهٗ وخبأته لهذا اليومِ، فإذا أنامتُّ فاجعل ذلك القميصَ دونَ كفنى ممّا يلى جلدى، وخُذْ ذلك الشعرَ والأظفارَ فاجعلَهُ في فمي وعلى عيني ومواضع السجود مني. (الاستيعاب، ص:٤٧٣، ج:٣)

''اے بیٹے! میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ تھا، آپ حاجت کے لیے نکلے، میں چھاگل لے کر آپ کے پیچھے گیا، (اور وضو کرایا) تو آپ نے زیب تن کیے ہوئے دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا مجھے عنایت فرمایا، وہ میں نے اس دن کے لیے چھپا رکھا تھا۔ (اسی طرح) رسول اللہ

ﷺ نے ایک دن اپنے ناخن اور بال مبارک کاٹے، تو میں نے انھیں لے لیا تھا اور اس دن کے لیے حفاظت سے رکھ لیا تھا، تو تم اس قمیص کو میرے کفن کے نیچے میرے بدن سے متصل رکھ دینا۔ اور وہ بال اور ناخنِ مبارک لے کر میرے منھ میں اور میری آنکھوں اور سجدہ کی جگہوں پر رکھ دینا۔''

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی جانب سے موئے مبارک حاصل ہوئے تھے، انھوں نے بھی ان کو بحفاظت رکھا تھا، چناں چہ ''مسند احمد'' میں ہے:

عن محمدِ بنِ عبد اللّٰه بن زيدٍ أن اباهُ حدثهٗ أنه شهد النبيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم عندَ المنحر هو ورجل من قريشٍ وهو يقسم الأضاحي، فلم يصبه شيءٌ ولا صاحِبَه، فحَلَقَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم رأسَهٗ في ثوبهٖ فأعطاه فقسّم منه على رجالٍ، وقَلَمَ اظفارَهٗ فأعطاه صاحِبَهٗ. قال: فإنَّهٗ عندنا مخضوبٌ بالحناء، والكتمِ يعني شعرَهٗ. (مسند أحمد، ص:٤٢، ج:٤)

''محمد بن عبداللہ بن زید سے مروی ہے کہ ان کے والد عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے ان سے بیان کیا، کہ وہ اور ایک قریشی آدمی منحر کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب موجود تھے، دراں حالیکہ آپ قربانی کے جانور تقسیم فرمارہے تھے، ان کو اور ان کے ساتھی کو کوئی جانور نہیں ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سرِ مبارک کا حلق اس طرح کرایا، کہ موئے مبارک آپ کے کپڑے میں گریں، آپ نے انھیں موئے مبارک عنایت فرمائے اور کچھ موئے مبارک دوسرے لوگوں میں تقسیم فرمائے۔ آپ نے اپنے ناخن مبارک تراشے، وہ ان کے ساتھی کو دیے۔ راوی فرماتے ہیں: وہ یعنی موئے مبارک ہمارے پاس ہیں، جو حناء اور ایک خاص قسم کے پودے کے رنگ سے رنگین ہیں۔''

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک محفوظ تھے، کسی کو نظر بد لگتی، یا کوئی بیمار ہوتا، تو پانی بھیجتے، موئے مبارک اس میں ڈال دیئے جاتے، لوگ وہ پانی استعمال کرتے، تو ان کی برکت سے شفا مل جاتی؛ چنانچہ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

حدَّثَنا مالكُ بنُ اسماعيلَ قال: حدثَّنا اسرائيلُ، عن عثمانَ بنِ عبد اللّٰه بن موهب قال: ارسلَني أهلي إلى أم سلمةَ بقدحٍ من ماء – وقَبَضَ اسرائيلُ ثلاثَ أصابعَ – من قصة (او فضة)، فيه (او فيها) شعرٌ من شعرِ النبى صلى اللّٰه عليه وسلم وكان إذا أصاب الإنسانَ عينٌ أو شيءٌ بَعَثَ إليها مخضبه، فأطلعتُ في الجلجل، فرأيتُ

شعراتٍ حُمُرًا. (صحيح بخارى، ص:۸۷۵، ج:۲ كتاب اللباس، باب ما يذكر في الشيب).

ترجمہ:(۱)''امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ہم سے مالک بن اسماعیل نے، ان سے اسرائیل نے روایت بیان کی، وہ عثمان بن عبداللہ بن موہب سے نقل کرتے ہیں، کہ میرے گھر والوں نے مجھے پانی کا پیالہ دے کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا (اور اسرائیل نے تین انگلیاں سکیڑیں) بالوں کے گچھے کی وجہ سے چاندی کے اس پیالہ کی وجہ سے، جس میں نبی ﷺ کے موئے مبارک تھے۔

جب کسی انسان کو نظرِ بد لگتی، یا کوئی اور عارض و بیماری پیش آتی، تو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس اپنے ٹب کو بھیجتا، عثمان بن عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے ڈبیہ میں جھانکا، تو میں نے سرخ موئے مبارک دیکھے۔''

رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بعد والوں کو حاصل ہوئے۔ چناں چہ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

عَنِ ابنِ سيرينَ قال: قلت لعَبِيدةَ: عندنا من شعرِ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم اَصبناه مِن قبلِ انس او من قبل أهل انس. فقال: لأن تكون عندى شعرة منه أحب اليّ مِنَ الدنيا وما فيها. (صحيح بخاري، ص:۲۹، ج:۱، كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعرُ الإنسان)

''حضرت محمد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، کہ میں نے عبیدہ (سلمانی) سے کہا: ہمارے پاس نبی ﷺ کے چند موئے مبارک ہیں، جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، یا کہا کہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاندان کی جانب سے حاصل ہوئے ہیں۔ عبیدہ سلمانی نے کہا: میرے پاس آپ ﷺ کا ایک موئے مبارک ہونا مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسند ہوتا۔''

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ''خلق قرآن'' کے مسئلہ میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے نقل فرمایا ہے، کہ معتصم کی خلقِ قرآن کی بات نہ ماننے پر اس نے کہا:

خُذُوهُ واخلعوه واسحبوه. قال أحمد: فأخذتُ وسحبتُ وخلعتُ وجيء بالعقابين والسياط وأنا انظر، وكان معي من شعراتِ النبى صلى اللّٰه عليه وسلم

مصرورة في ثوبي، فجردوني منه وصرت بين العقابين. (البداية والنهاية ص:۳٦۸، ج:۱۰)

''ان کو پکڑو اور کھینچو اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ مجھے پکڑ کر کھینچا گیا اور میرے ہاتھ اکھیڑے گئے۔ اور میری نظروں کے سامنے تازیانے لگانے کے لیے دو لکڑیاں اور کوڑے لائے گئے۔ میرے ساتھ نبیٔ اکرم ﷺ کے موئے مبارک میں سے چند موئے مبارک تھے، جو میرے کپڑے میں بندھے (رکھے) ہوئے تھے، انھوں نے وہ کپڑا میرے بدن سے اتار لیا اور میں دو لکڑیوں کے درمیان (معلق) ہو گیا۔''

حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

قال: وقد كانَ صار اليّ شعرٌ من شعرِ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم في كُمّ قميصي، فوجَّه اليّ اسحاقُ بنُ ابراهيمَ، يقول: ما هذا المصرور؟ قلت شعرٌ من شعر رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وسعى بعضهم ليخرق القميص عنّي، فقال المعتصم لاتخرقوه، فنزع، فظننت أنه إنما دُرِئَ عن القميصِ الخرقُ بالشعر. (سير أعلام النبلاء، ص:٤٨١، ج:۹)

''امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ نبی ﷺ کے موئے مبارک میں سے چند موئے مبارک مجھے حاصل ہوئے تھے، جو میرے کُرتے کی آستین میں تھے، اسحاق بن ابراہیم میرے پاس آ کر کہنے لگا: یہ بندھی (رکھی) ہوئی چیز کیا ہے؟ میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کے چند موئے مبارک ہیں، خلیفہ کے آدمیوں میں سے ایک میرا کُرتا پھاڑنے کے لیے لپکا، تو معتصم نے کہا: اس کو مت پھاڑو، پس کرتا اتار لیا گیا، میرے گمان میں موئے مبارک کی برکت کی وجہ سے کرتا پھاڑے جانے سے محفوظ رہا۔''

موجودہ زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کا وجود

مذکورہ بالا روایات وعباراتِ کتب سے معلوم ہوا، کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے، حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے انھیں بحفاظت رکھا اور ان سے برکت حاصل کرتے رہے، پھر انھیں سے وہ موئے مبارک بعد والوں میں منتقل ہوئے، ممکن ہے کہ اسی طرح قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسلٍ موئے مبارک بعد والوں میں منتقل ہوتے ہوئے آج

کے زمانے میں کسی کے پاس پہنچے ہوں، اور وہ اس کے پاس موجود ہوں۔

ترکی میں استنبول کے مشہور عجائب گھر توپ کاپے سرایے میں موجود تبرکات بشمول موئے مبارک کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم اپنے مشہور سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آں حضرت ﷺ کی طرف منسوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے، کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مستند ہیں، ان میں سرورِ دوعالم ﷺ کا جبۂ مبارک، آپ کی دو تلواریں، آپ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے، کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقش شاہِ مصر کے نام آپ کا مکتوبِ گرامی اور آپ کی مہرِ مبارک شامل ہیں۔'' (جہانِ دیدہ، ص: ۳۳۸)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''طوب قابی (توپ کاپے) کے میوزیم میں کئی ہال ہیں، ایک ہال میں حضور ﷺ کی دو تلواریں چاندی کے ایک صندوق میں رکھی ہوئی ہیں، یہیں سونے کے دو صندوق ہیں، ایک میں حضور ﷺ کا موئے مبارک اور مہر ہے، جو عقیق کو تراش کر بنائی گئی ہے، مہر گلابی رنگ کے عقیق کی ہے اور بیضوی شکل کی ہے....'' (مقالاتِ حکیم الاسلام، ص: ۳۸۷)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے اپنے سر کے موئے مبارک اتار کر تقسیم فرمائے ہیں، ظاہر ہے، کہ بال سر پر ہزاروں ہوتے ہیں، وہ کتنوں کے پاس پہنچے ہوں گے، اور اس میں ایک ایک بال کے کتنے حصے کر کے ایک ایک نے آپس میں تقسیم کیے ہوں گے، اور کتنے حفاظت سے رکھے ہوں گے، اس لیے اگر کسی جگہ موئے مبارک کا پتہ چلے، تو اس کی جلدی تکذیب نہ کرنا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت، ص: ۱۳۹، ۱۴۰، ج: ۱۱)

''فتاویٰ رحیمیہ'' میں ہے:

سوال: یہ مشہور ہے، کہ اکثر بڑے شہروں میں اور دیہات میں حضور پُرنور ﷺ کے موئے مبارک ہیں، کیا یہ درست ہے؟ اور کیا اس کی تعظیم کی جائے؟

الجواب: حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ نبیٔ کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے موئے مبارک صحابۂ کرام کو تقسیم فرمائے تھے۔ ''فتاویٰ ابن تیمیہ'' میں ہے: فان النبی صلی اللّٰہ علیہ

وسلم حَلَقَ رأسَهٗ، واعطیٰ نصفَهٗ لأبی طلحۃَ ونصفَهٗ قَسَّمَهٗ بینَ الناسِ. (ص:۴۳، ج:۱) تو اگر کسی کے پاس ہو، تو تعجب کی بات نہیں۔ اگر اس کی صحیح اور قابل اعتماد سند ہو، تو اس کی تعظیم کی جائے، اگر سند نہ ہو اور مصنوعی ہونے کا بھی یقین نہیں، تو خاموشی اختیار کی جائے، نہ اس کی تصدیق کرے اور نہ جھٹلائے، نہ تعظیم کرے اور نہ اہانت کرے۔ فقط (فتاویٰ رحیمیہ، ص:۲۷۷، ج:۲، مکتبہ رحیمیہ، انڈیا)

موئے مبارک کی زیارت

موئے مبارک اگر اصلی ہوں، تو دیگر تبرکاتِ نبویہ علی صاحبہا الف الف صلاۃ وتحیۃ کی طرح اس کی زیارت باعثِ خیر وبرکت ہے؛ لیکن شرط یہ ہے، کہ اس میں افراط وتفریط نہ ہو، کوئی اعتقادی یا عملی خرابی نہ ہو، رسومِ بدعت اور بے پردگی نہ ہو، زیارت میں کوئی تاریخ ودن معین اور ضروری نہ سمجھا جائے۔

موئے مبارک کا بڑھنا

آج کل بعض اشخاص کا کہنا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک جن حضرات کے پاس ہیں، ان سے تصدیق حاصل کی ہوئی ہے، کہ موئے مبارک سے دوسرے موئے مبارک پیدا ہوتے ہیں، مثلاً ایک تھا، تو دو تین ہوگئے، کسی کے پاس تو ایک ہی تھا، مگر ایک میں سے پیدا ہوتے ہوتے ایک سو بیس تک پہنچ گئے، اس نے کئی آدمیوں کو دیے۔

مذکورہ بعض اشخاص کی رائے کے تجزیے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اوّلاً سائنٹفک طریقے سے کٹا، یا اکھڑا ہوا بال بڑھ سکتا ہے یا نہیں، ان کو زیر بحث لایا جائے۔

سائنس کہتی ہے، کہ بال اگنے کا عمل غدود (FOLLICLE) میں ہوتا ہے، اور یہ غدود ہماری چمڑی میں ہوتا ہے۔ پھر بال مردہ قراتین خلیے (CELLS KERATIN, PROTEIN) سے بنتا ہے، اور اس کے بڑھنے کے لیے غدود میں خون کا سیلان وجریان ضروری ہے۔

اس اعتبار سے ظاہر ہے، کہ جب بال کٹا یا اکھڑا ہوا ہو، تو وہ از خود بڑھ ہی نہیں سکتا؛ کیوں کہ اس کے بڑھنے کے لیے بنیادی چیزیں چمڑی اور غدود ہی ندارد ہے۔

اس سے معلوم ہوا، کہ جن لوگوں کے پاس واقعتاً رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک ہیں، ان

کا سائنٹفک طریقے سے بڑھنا تو ناممکن ہے۔

جہاں تک معاملہ ہے خرقِ عادت کے طور پر بڑھنے کا، جسے یا تو معجزہ کا نام دیا جائے یا کرامت کا؛ چناں چہ علامہ شہاب خفاجی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، کہ خرقِ عادت سے مقصود محض تشریف وتکریم ہو، تو وہ کرامت ہے، خواہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو یا ولی کے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ کی عبارت سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ (نسیم الریاض شرح الشفاء للقاضی عیاض: ۴۴۰، ج:۲، الباب الرابع) تو اس کے لیے بنیادی بات یہ معلوم کرنی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد خوارق کا ظہور ہوسکتا ہے یا نہیں؟

بعد از وفات خوارق کے ظہور کے سلسلے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے ''کراماتِ امدادیہ'' میں تحریر فرمایا ہے:

''جاننا چاہیے، کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات وخوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معناً حدِّ تواتر تک پہنچ گیا ہے۔'' (ملفوظات حکیم الامت، ص:۱۰۴، ج:۲۹ بحوالہ کرامات امدادیہ)

جب ولی سے انتقال کے بعد خوارق کا صدور ہوسکتا ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نبی سے بطریقِ اولیٰ صدور ہوسکتا ہے؛ چناں چہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''دربارِ نبوت کی حاضری کا ایک عجیب واقعہ'' (نبی کریم ﷺ کا معجزہ بعد الوفات) کے زیرِ عنوان ''فیض الجود'' کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

''سرورِ عالم ﷺ کے معجزاتِ باہرہ کے سامنے یہ کوئی بڑی چیز نہیں؛ لیکن اس سے یہ امر اور ثابت ہوا، کہ رسالت مآب ﷺ جس طرح روضۂ اقدس میں زندہ تشریف فرما ہیں، اسی طرح آپ کے معجزات کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں، سیکڑوں کی تعداد میں امت کے ہر طبقے کو پیش آتے رہتے ہیں۔'' (کشکول، ص:۱۴۹)

اس سے معلوم ہوا، کہ رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی خوارق کا ظہور ہوسکتا ہے، لہٰذا آپ ﷺ کے موئے مبارک کے بڑھنے کا معجزہ یا کرامت مستبعد نہیں؛ بلکہ آپ کے خوارقِ عظیمہ شہیرہ کے سامنے یہ تو ادنیٰ بات ہے؛ مگر آج تک بندہ کی نظر سے کسی معتبر کتاب میں موئے مبارک بڑھنے کا یہ معجزہ یا کرامت نہیں گزری، اور نہ ہی کسی معتبر وثقہ آدمی سے سنی۔

آج جو بعض لوگ کہہ رہے ہیں، کہ ایک موئے مبارک سے دوسرے موئے مبارک پیدا ہورہے ہیں، تو تعجب وحیرت اس بات پر ہے، کہ اس خارقِ عادت امر کا ایسا معنی خیز اخفاء کیوں

ہے؟ اوراس کواس طرح صیغۂ راز میں کیوں رکھا جارہا ہے؟ ایسا کیوں نہیں کیا جاتا، کہ صاحبِ بصیرت وبصارت، معتبر وثقہ اور عادل اشخاص کوموئے مبارک بڑھنے کے اس عمل کا مشاہدہ کرایا جائے؛ تاکہ وہ اس کا حتمی فیصلہ کرسکیں، کہ یہ کسی خداع وتزویر، حیلہ وتدبیر، مسمریزم وقوتِ متخیلہ میں تصرف اورشعبدہ بازی ونظر بندی کی کرشمہ سازی ہے، یاصرف اورصرف کائن من الغیب ہے۔

❁ ❁ ❁

روشنی کے مینار، قدیم فضلاءِ دیوبند!

از: ساجد احمد صدوی، شعبہ تخصص فی علوم الحدیث،
جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی

زمانہ دیکھے ہوئے لوگ زندہ تاریخ ہوا کرتے ہیں، ان کی باتیں، ان کی معلومات، خیالات اس عہد کی یاد دلاتے ہیں جس کو وہ پیچھے چھوڑ کر آئے ہوتے ہیں، ان کی زندگی، ان کے مشاہدات، تجربات اس ماحول، مجالس، معاشرہ کی جھلک پیش کرتے ہیں، جس کو اب صرف تاریخ کے بے جان اوراق میں ہی دیکھا جاسکتا ہے، جو شخصیات لمبی عمر پاتی ہیں، وہ پچھلی زندگی، اس کی روایات، اس کے مسائل، چھوٹے بڑے واقعات، حالات، تجربات، قصے کہانیوں اور سربستہ رازوں کی جیتی جاگتی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں؛ بلکہ کتابوں میں مذکور مواد کی بھی تصدیق وتردید، مبہم کی توضیح، اجمال کی تفصیل انہی سے حاصل ہوتی ہیں؛ تاریخی پیچیدگیوں کو وہی حل کرتے ہیں واقعات، تاریخ ان کے سامنے رقم ہوئی ہوتی ہے، وہ اس کے عینی شاہد اور داخلی رموز واشارات کے شناسا ہوتے ہیں۔

مستقبل کے لیے تیاری، حال میں ہوتی ہے اور حال کے لیے ماضی سے مضبوط رشتہ استوار رکھنا، اس کی ہر اونچ نیچ سے واقف ہونا، ہر زندہ قوم کے ہاں ایک بدیہی اور ضروری امر تصور کیا جاتا ہے؛ مگر عموماً ماضی کو پڑھنے کے لیے انسان کو بعد میں لکھی ہوئی تحریروں سے ہی اپنا کام نکالنا پڑتا ہے، پھر جس قدر راوی کی ثقاہت، اس کی عدالت ہوتی ہے، اسی کے بقدر تاریخ کا فنی مرتبہ متعین ہوتا ہے، بسا اوقات ماضی کو پڑھنے کے لیے بعد میں لکھی ہوئی ایسی تحریروں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، جس میں زبان وبیان کے طبعی فرق کے ساتھ ساتھ صاحبِ قلم کی ترجیحات کا بھی پورا اثر ہوتا ہے، ایسی صورت میں ایک سنجیدہ قاری تاریخی روایات میں باہم مقابلہ کرنے اور تنقیدی نظر سے دیکھنے کا محتاج ہوتا ہے، جس کے لیے پچھلے دور کو دیکھی ہوئی شخصیات سب سے بڑا سہارا ہوا کرتی ہیں، وہ فنی سوالات کا جواب دیتی ہیں، اشکالات کو دور کرتی ہیں اور کھرے کھوٹے

کا فرق بآسانی سمجھا دیتی ہیں۔

علمی، فنی اور تاریخی جہات کے علاوہ بھی ان طویل العمر شخصیات کی اہمیت، قدردانی اور مقام ومرتبہ شناسی کے کئی پہلو ہیں، امت مسلمہ کا تابناک، مثالی دور وہ ہے، جو گزر چکا ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ کا عظیم دورانیہ بھی وہی ہے، جس میں انسانیت کی عظیم شخصیات حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام بالخصوص سید الانس والجان حضرت حبیبِ خدا رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم المرتبت شخصیت موجود تھی، کامیابی وکامرانی، انسانیت شناسی، معرفت خدا وندی، رفع درجات، ترقی حقیقی کے لحاظ سے وہی دور انسانیت کا سب سے تابناک اور حسین دور تھا؛ اس لیے جو لوگ اس کے قریب ہیں، ان کی نسبتیں عالی سمجھی جاتی ہیں، وہ خیر وبرکت کے سرچشمے، علوم ومعرفت کے خزانے ہوا کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند متحدہ ہندوستان کی پچھلی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگر یوں کہا جائے کہ اس خطے کی پچھلی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ بلکہ اسلامی دنیا کی تاریخ کو، اس کے پیچ وخم کو، اس کے اہم واقعات، عوامل کو سمجھنے کے لیے جنوبی ایشیا کے اس عظیم ادارے اور اس سے وابستہ افراد وشخصیات کی تاریخ، ان کی زندگی، کارنامے اور خدمات کی طویل فہرست سے واقفیت ضروری ہے، تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا، بلاشبہ دارالعلوم دیوبند اپنے زبردست کردار، عظیم شخصیات کے ساتھ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے مسلم دنیا پر واضح اثرات رکھتا رہا ہے، اسی درس گاہ کی تعلیم وتربیت اور کارناموں کی بدولت برصغیر کے مسلمان عجمی ہونے کے باوصف دنیا کے نئے منظرنامے پر ایک بڑے عامل کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں، راسخ العقیدہ مسلمانوں کی اِس عظیم جمعیت کا مستقبل جن خطوط پر استوار ہوگا اور اس کے لیے جو لوگ میدان عمل میں کام آئیں گے، ان کے لیے اپنی موجودہ حالت کو اُس رخ پر لے جانا ہوگا، جس طرف کو دیوبند کی قدسی صفات شخصیات لے جانا چاہتی تھیں۔

آج کے مقتدایانِ قوم وملت کو اپنا رشتہ متحدہ ہندوستان کی ان شخصیات سے وابستہ کرنا ہوگا، جو اس عظیم جمعیت کے لیے پیشوا کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کی زندگی، کارکردگی، اثرات ونتائج میں ''تائید غیبی'' اور ''اجتباءِ خاص'' کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا ہوگا؛ کیونکہ دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ رجال کار کی تاریخ کا تعلق براہِ راست جنوبی ایشیا کے مسلمانوں سے ہے، جو اللہ تعالی کی خاص توفیق وتائید سے اپنی علمی صلاحیت، عملی قوت، ایمان وغیرت کی دولت

اور کثرتِ تعداد کی بدولت عرب وعجم کے مسلمانوں کو اپنے زیر اثر رکھے ہوئے ہیں، اور یوں پوری مسلم وغیر مسلم دنیا ان کے لیے محنت کا میدان بنی ہوئی ہے، اور برابر اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے ہر جگہ ان کی رسائی ہوچکی ہے، اور دنیا کی تمام قومیں ان سے ایمان واسلام کا درس لے چکی ہیں۔

نسبتِ دیوبند کا مقام واحترام:

دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ رجالِ کار کی اس تابناک تاریخ کی بنا پر آج بھی دیوبند اور دیوبندی تمام تر سازشوں، پروپیگنڈوں اور دھونس دھمکیوں کے باوجود مسلم دنیا میں عظمت واحترام اور غیرت وحمیت کا نام ہے، اور اس کے بالمقابل کفر ونفاق کی دنیا میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے محافظ ہونے کی وجہ سے حسد، کینہ اور عداوت کے سب سے بڑے مورد ہیں، جس کے اثرات کو ختم یا کم کرنے کے لیے وہ اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائے ہوئی ہے۔

جو لوگ اس عظیم ادارے سے وابستہ رہے ہیں، جن کی جدوجہد، لگن، خون پسینے کا نام دیوبند ہے، خود ان کا وجود، ان کی زندگی بھی مسلم دنیا میں عظمت واحترام کی بڑی علامت ہے؛ یہی وجہ ہے کہ فضلاءِ دیوبند سے رشتۂ تلمذ کو قابلِ فخر سمجھا جاتا ہے، ان کی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کے قول وفعل سے راہنمائی لی جاتی ہے، ان سے نسبت جوڑنے کے راستے تلاش کیے جاتے ہیں، آج بھی عرب وعجم میں جہاں جہاں لوگ اسلامی علوم وفنون سے وابستگی رکھتے ہیں، اور اس کے درس وتدریس، تصنیف وتالیف کا مشغلہ اپنائے ہوئے ہیں، وہ کسی نہ کسی طرح اپنی علمی نسبت فضلاءِ دیوبند واکابرِ دیوبند کی طرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، متحدہ ہندوستان سے جو لوگ حجازِ مقدس یا دوسرے بلادِ عربیہ کا سفر اختیار کرتے ہیں، علم کے سچے طالب بڑے شوق ورغبت سے ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے امنڈ آتے ہیں اور ان سے اجازتِ حدیث وعلوم حاصل کرکے یوں فرحاں وشاداں ہونے لگتے ہیں، جیسے برسوں کی متاعِ گم گشتہ اُن کے ہاتھ لگی ہے۔

حاسدوں، دشمنوں نے طرح طرح کی ترکیبیں کیں، سازشوں کے جال بُنے، لوگوں کو بدگمان کرنے کی ہزار تدبیریں کیں، کسی نے ''مجہول التعریف'' بغاوت، دہشت گردی کا واویلا کیا، کسی نے ''حسام'' اور ''الدیوبندیہ'' کا راگ آلاپا، کسی نے محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم سے

رشتۂ عشق ومحبت کاٹنے کی ناکام کوشش کی، توکسی نے ختمِ نبوت پر کامل یقین کی سزا دینا چاہا، کسی کو اہلِ بیت نبوت سے دور کرنے کی سوجھی، توکسی کو حدیثِ نبوی سے الگ کرنے کی ترکیب مفید نظر آئی، کسی نے لوہے کی سلاخیں دکھا کر دھمکایا، توکسی نے زر وزن کی ہتھکڑیاں ڈالنے کی کوشش کی، کوئی ان کو ترقیٔ معکوس کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا رہا، توکوئی حریتِ بدفکری وبدعملی کا مخالف ہونے پر نشانہ بنائے رہا، کوئی تقلید کا طعنہ دیتا رہا، توکوئی غیرت وحمیتِ دینی کو فلسفہ عدم برداشت باور کراتا رہا، کفر و نفاق کی فوجوں نے، ان کے زرخرید غلاموں، چندٹکوں میں بکنے والے سیاستدانوں اور اے بی سی پل بھر میں بدلنے والے دانشوروں، سب نے اپنا اپنا حصہ ڈالا، زور آزمائی کی، اور برابر کرتے رہے؛ مگر اللہ تعالی کی تدبیر سب پر غالب رہی، اس نے شیطانوں کے تمام تر منصوبے، پروگرام خاک میں ملادئے، سچ ہے:

جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے

ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام اہم دینی اداروں اور مؤثر شخصیات کا ''علمی اور روحانی نسب نامہ'' دیوبند کی اسی عظیم درس گاہ سے جاملتا ہے، علمیت و روحانیت کے لبالب چشموں کے سوتے اسی خاکِ دیوبند میں ہیں، جہاں علم وعمل کے دریا بہتے ہیں، جس کے باغ وبہار کی مہک اقصائے عالم کو پہنچی ہے، جس کے بلند قامت درخت آسمانِ بلندی کو چھوتے ہیں، آفتابِ ختم نبوت کی ضیا پاشیوں سے جس کی آبیاری کی جاتی رہی ہے۔

آج ہم اس عظیم مرکز کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرکے یہ جرأت کرسکے ہیں؛ مگر یہ ظاہر بین نگاہوں کی باتیں ہیں، ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ، مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء، پنجشنبہ کو نہایت بے سروسامانی کے عالم میں ''چھتہ مسجد'' کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سایہ میں، جس ادارہ کی بنیاد رکھی جارہی تھی، اور ایک استاد، ایک شاگرد سے جس کارِ فقیری کی عمارت بلند کی جارہی تھی، ابھی اس کو تیرہ سال ہی گزرے تھے، کہ اس کی عظیم برکات اور فیوض کا سلسلہ اتناعام ہوا، کہ یکم صفر ۱۲۹۶ھ کو ایک مردِ بینا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالی نے، جلسۂ انعام کے موقع پر ارشاد فرمایا:

''خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے، کہ تیرھواں سال اس مدرسہ کا جس کو ''دارالعلوم'' کہنا بجا ہے، بخیر وخوبی پورا ہوا، اس تھوڑے سے عرصے میں اسلام اور اہل اسلام کو بے شمار نفع پہنچا، بے اختیار اس کے حق میں یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

تم سلامت رہو، ہزار برس
اور ہر برس کے ہوں دن ، پچاس ہزار‘‘

(روداد ۱۲۹۵ھ ص:۱۶، و ۱۲۹۶ھ ص:۱۱، بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند، از سید محبوب رضوی، ص:۱۸۸، طبع اول)

اللہ تعالی کی طرف توجہ، تواضع وانکساری اور دور بین نگاہی کی حامل مردِ بینا کی یہ بات کس قدر واقعہ وحقیقت کے مطابق ہے، ہم جیسے ظاہر بینوں کو بھی روزِ روشن کی طرح نظر آرہی ہے۔

وطنِ عزیز میں موجود قدیم فضلاءِ دیوبند:

نبوی علوم کے وارث، قدیم فضلاء دیوبند کی تعداد اب بہت کم ہوتی جارہی ہے، ماضی قریب میں بھی نہایت اہم شخصیات، قدیم فضلاءِ دیوبند ہم سے رخصت ہوچکے ہیں، رفتہ رفتہ ان کے وجودِ مسعود سے سرزمین خالی ہوتی جارہی ہے، تاہم اب بھی روشنی کے چند مینار ایستادہ ہیں، جن کی نورانی شعاعوں سے مسافرانِ منزل ظلمتوں میں راہ پاتے ہیں، جن کے دم قدم سے علم وعمل اور خیر وبرکت کی مجلسوں کی رونقیں بحال ہیں، ’’حریتِ بدفکری‘‘ اور ’’حریتِ بدعملی‘‘ کے لیے ’’پرکشش نام ولیبل‘‘ استعمال کرنے والوں کو مسلسل ناکامی کا سامنا ہے، فتنوں، آزمائشوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ’’حق وثبات‘‘ کے دیئے روشن کیے ہوئے ہیں، یاس وناامیدی کی گھڑیوں میں امید کی آخری کرن ہیں، تمام علوم وفنون، بالخصوص حدیث اور علومِ حدیث میں سلفِ صالحین سے نسبتیں جوڑنے کا واسطہ ووسیلہ ہیں، اجازت کے مبارک، متوارث سلسلے کے حصول کے لیے مرجع ہیں، اور بے شمار خوبیوں کے ساتھ قوم، ملک وملت کے لیے ان کا وجود اللہ تعالی کی طرف سے عطیہ، انعام اور برکت کا سبب ہے۔

ان میں سے چند حضرات تو وہ ہیں، جن کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، ایک بڑی دنیا ان سے وابستہ ہے، ان کے افادات وفیوض کا مبارک سلسلہ برابر جاری ہے، اور کچھ نام ایسے بھی ہیں، جو اپنی قدامت، عمر اور طبقہ کے اونچا ہونے کے باوصف شہرت وناموری سے دور ہیں، میڈیا کے زیر اثر ماحول میں رہتے ہوئے بھی، گوشہ گمنامی میں رہتے ہیں، خال خال ہی ان کا ذکر ہوتا ہے، اور کسی کسی کا ان کی مجلس سے گزر ہوتا ہے، ان سے فیض پانے والوں کا کوئی تانتا نہیں بندھا ہوتا، اس میں ان کی طبیعت کی نزاکت، صحت وضعف کے اثرات، سہولیات کا فقدان اور شہرت کے رسمی مقامات سے دوری کو بھی دخل ہوتا ہے؛ مگر ان سب سے بڑھ کر ہم جیسوں کی

نااہلی اور ناقدری بھی ایک معلوم سبب ہے، جس کی وجہ سے محرومی ہوتی ہے۔

روشنی کے ایستادہ مینار:

وطن عزیز میں قدیم بزمِ دیوبند وسہارنپور کی جو شمعیں اس وقت جلی ہوئی ہیں، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں:

۱- شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب لوہاروی دامت برکاتہم، جامعہ فاروقیہ، کراچی، صدر وفاق المدارس العربیہ، اسلامی جمہوریہ پاکستان.

۲- حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحب چشتی دامت برکاتہم، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی.

۳- حضرت مولانا محمد احمد صاحب انصاری دامت برکاتہم، پیپلز کالونی، بہاولپور.

۴- حضرت مولانا محمد جمشید علی صاحب دامت برکاتہم، مدرسہ عربیہ، رائے ونڈ.

۵- حضرت مولانا عبدالحنان صاحب دامت برکاتہم، جہانگیرہ، ضلع نوشہرہ.

۶- حضرت مولانا محمد عبیداللہ صاحب اشرفی دامت برکاتہم، جامعہ اشرفیہ، لاہور.

۷- حضرت مولانا عبدالستار صاحب تونسوی دامت برکاتہم، تونسہ شریف، ضلع ڈیرہ غازی خان.

۸- حضرت مولانا خالد محمود صاحب دامت برکاتہم، اسلام آباد (مانچسٹر).

۹- حضرت مولانا محمد نافع صاحب دامت برکاتہم، محمدی شریف، ضلع جھنگ.

۱۰- حضرت مولانا عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم، کلاچی، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان.

۱۱- حضرت مولانا محمد احسان الحق صاحب دامت برکاتہم، مدرسہ عربیہ، رائے ونڈ.

۱۲- حضرت مولانا احمد اقبال صاحب دامت برکاتہم، جامشورو، حیدرآباد، سندھ.

۱۳- حضرت مولانا مجاہد خان صاحب دامت برکاتہم، نوشہرہ کلاں، ضلع نوشہرہ، خیبر پختونخوا.

۱۴- حضرت مولانا اللہ بخش صاحب دامت برکاتہم، کوٹ قیصرانی، تونسہ شریف، ضلع ڈیرہ غازیخان.

۱۵- حضرت مولانا حاجی غلام حیدر صاحب دامت برکاتہم، چھوٹالاہور، ضلع صوابی، خیبر پختونخوا.

۱۶- حضرت مولانا حمداللہ جان صاحب دامت برکاتہم، ڈاگی، ضلع صوابی.

۱۷- حضرت مولانا محمد اسلم صاحب دامت برکاتہم، چھوٹالاہور، ضلع صوابی.

۱۸- حضرت مولانا قاری آصف صاحب قاسمی دامت برکاتہم، جامع مسجد فاروقِ اعظم، ناظم آباد، کراچی (کنیڈا).

۱۹- حضرت مولانا غریب اللہ صاحب دامت برکاتہم، مانکی، جہانگیرہ، ضلع صوابی.

۲۰- حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب دامت برکاتہم، پراچہ ٹاؤن، کوہاٹ.

۲۱- حضرت مولانا حضرت علی صاحب دامت برکاتہم، سوکڑی کریم خان، بنوں، خیبر پختونخوا.

۲۲- حضرت مولانا مطلع الانوار صاحب دامت برکاتہم، شیر پاؤ، پشاور، خیبر پختونخوا.

۲۳- حضرت مولانا مفتی محمد اشرف صاحب چانڈیو دامت برکاتہم، ٹھٹھہ، سندھ.

۲۴- حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب دامت برکاتہم، کشروٹ، گلگت.

۲۵- حضرت مولانا حکیم عبدالرشید خان صاحب لوہاروی دامت برکاتہم، نیو کراچی، کراچی

ان حضرات کے تفصیلی حالات جمع ہونے تک یہ موضوع تشنۂ تکمیل ہے، ضرورت ہے کہ ان عظیم شخصیات سے استفادہ کیا جائے، ان کے اعذار، مصروفیات کا پورا پورا خیال کرکے، ان کی خدمت میں بصد ادب واحترام حاضری دی جائے اور ان کی چاہت، طبیعت کے مطابق خدمت کرکے دعائیں لی جائیں.

بزرگانِ دیوبند کا فہم وبصیرت:

یہ حضرات ہمارے نجی، اجتماعی، تعلیمی، تربیتی، ملکی، بین الاقوامی مسائل، مشکلات اور نئے چیلنجز کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں، ان کی باتوں میں، ان کے طرز وانداز میں سادگی، بے تکلفی وبے ساختگی کا فرق نمایاں ہوگا، یہ اونچے لوگوں کی شان ہوا کرتی ہے، اصحابِ بصیرت جانتے ہیں کہ ان کی سادہ گفتگو، تجاویز اور مشوروں میں کیا کیا برکتیں، حقائق پوشیدہ ہیں، جس کو ظاہر بین نگاہیں نہیں پاسکتیں۔

برکت کے ان سرچشموں سے فیض پانا، ان کی رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھنا، ان کی تجاویز کو تائیدِ غیبی کا حصہ سمجھنا، ان کے وجود کو برکت ورحمت کا باعث گرداننا، امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت کا لازمی حصہ ہے، جس پر طبقہ در طبقہ عمل ہوتا چلا آیا ہے، اور اسی کی وجہ سے ہمیشہ امت گرداب سے نکلی ہے، مصیبتوں اور آزمائشوں میں گر کر بھی اپنی جداگانہ شناخت، شان وشوکت اور آن بان کو نہ کھوسکی۔

بزرگانِ دیوبند سے ادنی نسبت رکھنے والا بھی علو اسناد، بڑے مشائخ سے نسبت اور اس کے نتیجہ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کی عظیم سعادت کو نظر انداز نہیں کرسکتا، اس قرب کے حصول کی طلب میں بھی دوسروں کی عظمتِ شان اور علوِ درجات کا اقرار پوشیدہ ہے ،جو حقیقی رفعتِ شان رکھنے والے متواضع لوگوں کی خصلت ہے ،نسبتوں کا احترام، اُس کی قدر بجائے خود ایک بڑی سعادت اور ہمیشہ خوش نصیب لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔

مغرب زدہ یا خود پسندی کے شکار لوگ اس کو ''قدامت پسندی''، اور ''شخصیت پرستی'' سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ان زمانہ ساز لوگوں کو راہ کی سب سی بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں؛ کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے خود اُن کو ترقی نہیں ملتی، لوگ ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتے، ان کی دانشوری سے استفادہ کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نہ ہوں تو ان کی ملمع سازیوں اور خود پسندیوں کے لیے میدان خالی مہیا ہو، پھر جس طرح چاہیں، مذہب کی ترویج، ضرورتِ زمانہ، تعمیر وترقی ، درپیش چیلنجز، اتحاد امت، وقت کی پکار، پالیسی، مفاہمت، عالمی برادری، حالات کی نزاکت، انسان دوستی، خدمتِ خلق، سرکاری مراعات، عہدوں کی تلاش، مفادات، وسیع تر تناظر اور بیسیوں نام وعنوانوں سے لوگوں کا شکار کرسکیں، مسلک ومذہب کا تیاپانچہ کرسکیں، تصلب وپختگی کی مسلکی شناخت کا سودا کرکے مغرب سے داد ودہش پاسکیں، اور دوسروں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنے تئیں ترجمانِ اسلام، سفیرِ اسلام، خادمِ دین، لیڈر، ممتاز مذہبی اسکالر، محقق، دانشور، خادمِ قوم وملت، رہبر وراہنما اور امت کے پُشتی بان بن سکیں!

بدیہی بات ہے جب کہ بڑی شخصیات اور ان کی علمیت وروحانیت نگاہ میں نہیں ہوتی ،تو بے وقت مشیخت وفضیلت کے خواب دیکھے جاتے ہیں، جس کا اثر یہ ہے کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کو دیکھ کر اب معمولی منشی درجہ کے لوگ بھی اسلامی جماعتیں بناتے ہیں، تحریکوں، انجمنوں کے سربراہ بنتے ہیں، درسِ قرآن، درسِ حدیث کی اپنے تئیں مجلسیں سجاتے ہیں، مختلف فیہ مسائل میں رائے دیتے ہیں، عربی بول چال سیکھنے سکھانے والے مفسرِ قرآن، اردو تراجم پر گزارہ کرنے والے محدث، ڈاکٹر اور فقہ سے نابلد مذہبِ خامس کا نام وعنوان استعمال کرتے نظر آتے ہیں؛ بلکہ منجھے ہوئے اہل علم وفن، مسلمہ ارباب تقوی وبصیرت کو بھی اپنی راہ چلنے کے مشورے دیتے ہیں، ان کی شکایتیں کرتے ہیں۔

شخصیات وتاریخِ دیوبند پر مزید کام کرنے کی ضرورت:

قدیم فضلاء دیوبند کی یہ فہرست ابھی ناتمام ہے، جو حضرات اس حوالے سے مزید شخصیات کے بارے میں جانتے ہیں، یا کسی نام کے بارے میں اشکال رکھتے ہیں، کسی کے تفصیلی حالات معلوم ہیں، وہ اس سلسلہ کی تکمیل کرسکتے ہیں، اس میں مزید اضافہ کرسکتے ہیں، جس سے طالبانِ علم، مؤرخین اور سوانح نگار سب کو فائدہ ہوگا۔

ہر شخصیت کے حوالے سے دوسری تفصیلات جاننے سے پہلے یہ چند بنیادی سوانحی معلومات فراہم ہونا ضروری ہے.

۱۔ صحیح نام ونسب، عرف:
۲۔ سن ولادت، مہینہ (ہجری، عیسوی):
۳۔ وطن، ابتدائی تعلیم وتربیت:
۴۔ دارالعلوم یا مظاہرِ علوم سے وابستگی، تاریخ (ہجری، عیسوی):
۵۔ مدتِ تعلیم اور سنِ فراغت، (ہجری، عیسوی):
۶۔ اساتذہ ومشائخ بالخصوص دارالعلوم یا مظاہرِ علوم کے زمانہ تعلیم میں:
۷۔ بعد از فراغت اہم مصروفیات، مشاغل:
۸۔ جائے سکونت، طریقۂ کار برائے افادہ واستفادہ:

استاذِ محترم حضرت اقدس مولانا چشتی صاحب دامت برکاتہم (فاضل دیوبند) کی رائے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، طبقاتِ رجال، انواعِ خدمات، اثرات اور عظیم کارناموں کے حوالے سے سندی اور فنی کام کرنے کی ضرورت ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، اس حوالے سے کئی طرح کے خطے اور خاکے تیار کیے جاسکتے ہیں، جو فنی، تاریخی ضرورتوں کے پیشِ نظر اہم عنوانات پر مشتمل ہوں، ان کی رعایت رکھتے ہوئے صاحبِ ذوق، معاصر علمی اسلوب اور تحقیقی کاموں سے عملی واقفیت رکھنے والے اربابِ قلم بہتر شکل میں کام کرسکتے ہیں، جو حضرات موجود ہیں، ان کی معلومات کو تحریری شکل میں محفوظ کیا جائے، اور جو تحریریں افراد، اداروں کے پاس جہاں جہاں، جس جس شکل میں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھا جائے، پھر اس میں عقیدت واحترام کے اظہار سے پہلے فنی اور سوانحی ضروریات، تاریخی حوالوں پر نگاہ مرکوز کی جائے، جس طرح اسماء الرجال

اورطبقات کی کتابوں میں ہوتا رہا ہے۔

اس عظیم کام کے لیے پہلے مصادر اورمراجع کی تعیین کرنی ہوگی، اور ہر مصدر ومرجع کی فنی ،تاریخی حیثیت پر گفتگو ہوگی، اسی طرح یہ مصادر ومراجع ، جو تحریرات اورشخصیات کی صورت میں موجود ہیں، ان کے اماکن، دستیابی کی یقینی اور ممکنہ جگہوں، شخصیات کے نام وپتے، طریقۂ استفادہ وغیرہ کو بتایا جائے گا، متعلقہ افراد کو وسعت ظرفی اور عالی ہمتی کا مظاہرہ کرنا ہوگا، تبادلۂ معلومات کی نئی نئی شکلوں کو اختیار کرنا ہوگا، جس کے نتیجہ میں دیوبند کا تذکرہ اور تاریخ مرتب ہوسکے گی، جس کی سندی، فنی اہمیت ہوگی، یہ خطے اور خاکے، مصادر ومراجع کا تعارف، طبقاتی تاریخ، معلوماتی فہرستیں اور تذکرے عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں تیار کرنے کی چیزیں ہیں، اس کی ضرورت سب کو ہے اور ہر جگہ ہے۔

دو ہم عصروں کی ایک صدی:

تاریخ حیرتوں اور عجائبات کا سمندر اپنے اندر رکھتی ہے، معاصر عظیم شخصیاتِ دارالعلوم دیوبند میں ایک ایسی جوڑی بھی ہے، جس کی رفاقت وہم عصری ایک صدی پر محیط ہے، جو نہ صرف ایک ہی سال دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، ایک ہی درس گاہ میں برابر پڑھتے رہے، آپس میں خوب دوستی تعلق رہا، ایک ہی سال ان کی فراغت ہوئی؛ بلکہ ان کی پیدائش کا سال بھی ایک ہی ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر دونوں ساتھیوں کو ایک صدی پر محیط طویل عمر بھی نصیب ہوئی، یہ جوڑی دارالعلوم دیوبند اور اکابرِ دارالعلوم دیوبند کے حالات ، واقعات ، روز وشب ،نشیب وفراز کی شاہد اور چلتی پھرتی تاریخ ہے۔

ان دونوں میں سے ایک سے تو دنیا واقف ہے، ان کے جاننے والے بہت ہیں، لوگ ان کو حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب رحمہ اللہ تعالی کے نام نامی سے یاد کرتے ہیں، جو دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے منصبِ جلیل پر فائز تھے، اور حضرت مولانا اسعد مدنی صاحب رحمہ اللہ تعالی کے بعد ''امیر الہند'' قرار دئے گئے تھے، ابھی حال ہی میں ان کا یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ھ، مطابق ۸، دسمبر ۲۰۱۰، بدھ کے روز اپنے وطن بجنور میں انتقال ہوا، جمعرات کی شب دارالعلوم میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اور قبرستانِ قاسمی میں اکابر دیوبند کے پاس آسودہ خاک ہوئے۔

دوسری شخصیت جواب اکیلی رہ گئی ہے، ان کے جاننے والے کبھی بہت تھے، ان کے

قدر دان بھی بڑے لوگ تھے، مگر ان سے واقف لوگ اب کم ہی رہ گئے ہیں، کبھی تو ان پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالی کی شفقتیں ہوتی تھیں، حضرت کشمیریؒ کی زیارتیں، حضرت محدث دیوبندیؒ، حضرت حکیم الامت علامہ تھانویؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت شیخ الأدب صاحبؒ، حضرت بلیاوی صاحبؒ، حضرت قاری صاحبؒ، حضرت ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ، آزاد صاحبؒ، حضرت میرٹھی صاحبؒ، حضرت عثمانی صاحبؒ، حضرت لاہوریؒ اور اس عہد کے دوسرے بزرگوں کی صحبتیں، مجلسیں اور عنائتیں ہوا کرتی تھیں، اور حضرت سیوہارویؒ، حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ، حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ، حضرت بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، حضرت عبدالحق انفع صاحبؒ، حضرت عبدالحق نافع صاحبؒ، حضرت بنوری صاحبؒ، حضرت پھولپوری صاحبؒ کی رفاقتیں ہوتی تھیں، اس دور کے دوسرے بزرگوں، مشائخ کی نیاز ومحبت پانے کی شکلیں ہوتی تھیں، مگر گئے وقتوں کے ساتھ اُن کی باتیں بھی جاتی رہیں، صرف یادیں باقی رہ گئیں۔

تاہم اب بھی حضرت اقدس مولانا چشتی صاحب دامت برکاتہم، حضرت اقدس صدر وفاق دامت برکاتہم اور ان کے متعلقین اپنے بزرگوں کی نسبتوں کے احترام میں ان کے پرسانِ حال رہتے ہیں، زیارت وملاقات کرتے ہیں یہ ان کا ظرف ہے اور اپنے بزرگوں کی نسبتوں کے احترام اور قدردانی کی عملی تعلیم جو وہ اپنے متعلقین کو دینا چاہ رہے ہیں۔

ایک شمعِ فروزاں:

''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالی نے اپنے اِس شاگرد کا ''اسماء گرامی حضرات مدرسین درجۂ فارسی'' کی فہرست میں اٹھارویں نمبر پر یوں ذکر کیا ہے، ''مولانا اصلح الحسینی مدظلہ، گلاؤٹھی، ابتدائی سن ۱۳۶۲ھ تا آخری سن ۱۳۶۷ھ''. (تاریخ دارالعلوم دیوبند، از حضرت حکیم الاسلام، مہتمم دارالعلوم، ص:۱۱۶، طبع: دار الاشاعت، کراچی، ستمبر ۱۹۷۲ء) اس فہرست میں حضرت مولانا محمد یاسین صاحب دیوبندی، رحمہ اللہ تعالی، حضرت مولانا خلیفہ منشی عاقل صاحب رحمہ اللہ تعالی کے نام نامی بھی موجود ہیں، حضرت والا اِس وقت بھی الحمدللہ اپنی نقاہت وعلالت، پیرانی سالی کے باوصف ہمارے درمیان موجود ہیں، موصوف کی ولادت حضرت اقدس مولانا سید محمد صالح صاحب مرحوم کے گھر ضلع بلندشہر کے قصبہ گلاؤٹھی میں بروز جمعرات، ۲۶/محرم الحرام ۱۳۳۲ھ، مطابق

۲۵/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ہوئی ، والد صاحب حضرت اقدس گنگوہیؒ سے بیعت تھے، حضرت کے دادا حضرت مولانا صوفی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالی گلاؤٹھی میں حضرت سالار مسعود غازی رحمہ اللہ تعالی کی جامع مسجد میں واقع اس مدرسہ منبع العلوم کے بانیوں میں شامل تھے، جہاں ان کے بقول حجۃ الاسلام علامہ نانوتوی رحمہ اللہ تعالی دہلی سے تکمیل کے بعد تدریس سے وابستہ ہوئے تھے، حضرت اقدس مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ تعالی بھی اسی مدرسہ کے پڑھے ہوئے تھے، شاید اسی وجہ سے موصوف کا ان سے تعلقِ خاطر تھا، گلاؤٹھی کا علاقہ تحریکِ آزادی کے مجاہدین کا تھا، جس کی وجہ سے حضرت نانوتویؒ کو ان سے خاص تعلق تھا، محلِ وقوع کے اعتبار سے بھی شاملی، میرٹھ وغیرہا جہاد ومجاہدین کے دوسرے مراکز قریب ہی واقع تھے۔

خود فرماتے ہیں: [غالبا] تیرہ سال کی عمر تھی ، فارسی پڑھ رہا تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالی گلاؤٹھی تشریف لائے تھے، موصوف کے والد حضرت کے پیر بھائی اور عمر میں ان سے چار سال چھوٹے تھے، دونوں ایک ہی سال قطب عالم حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے تھے، حضرت مدنی نے ازراہِ شفقت ، وخوش طبعی درجۂ فارسی کی مناسبت سے کچھ سوالات بھی کیے تھے، جس کو کبھی کبھی بڑی محبت سے سناتے ہیں۔ یہ پہلی زیارت وملاقات تھی، جس کے بعد عمر بھر کے تعلق اور نسبتوں کی سبیل پیدا ہوئی، تقریبا ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ دارالعلوم دیوبند آئے، حضرت علامہ کشمیری صاحبؒ ڈابھیل چلے گئے، تو ۳۱-۱۹۳۲ء میں حضرت مدنی، حضرت میاں اصغر حسین صاحب، حضرت بلیاوی صاحب ، حضرت شیخ الادب صاحب ، حضرت قاری صاحب رحمہم اللہ تعالی وغیرہم اکابرین سے دورۂ حدیث پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

حالات وواقعات:

دورۂ حدیث میں حضرت مولانا زاہد الحسینی صاحب ، حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مہاجر مدنی بن حضرت لاہوری، حضرت مولانا ایوب جان صاحب بنوری، حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب ، رحمہم اللہ تعالی اور حضرت اقدس مولانا عبدالحنان صاحب دامت برکاتہم [غالبًا] ان کے ہم درس رہے ، جو بجائے خود عظیم شخصیات ہیں، ان کی اپنی ایک تاریخ ہے، کیا عجیب پرنور ماحول ہوتا ہوگا، جب اس طرح کی عظیم شخصیات شاگردوں کی نشستوں پر بیٹھے زانوئے تلمذ تہ کرتی ہوں گی، تو مسندِ درس پر بیٹھنے والے اساتذہ

کا مقام کیا ہوگا! ہے کوئی درس گاہ روئے زمین پر جو پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اس طرح کی تابناک تاریخ رکھتی ہو؟

حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینی صاحب دامت برکاتہم بائیس برس کی عمر میں نواب حمید اللہ خان کے زمانہ میں ریاست بھوپال میں شرعی عدالت علیا کی مجلس علماء کے لیے منتخب ہوئے تھے، اس عالی منصب کے لیے مطلقاً انتخاب بھی بڑے فخر کی بات ہوا کرتی تھی، بڑے بڑے اہلِ علم ہی اس منصب کے لیے اہل قرار دئے جاتے تھے؛ چہ جائکہ بائیس سال کی عمر میں اس کے لیے منتخب ہوجانا!؛ مگر بدخواہوں کی بات چل گئی، تو اس پر رنجیدہ خاطر ہوئے، حضرت شیخ الاسلام کو خبر دی، حضرت شیخ الاسلام نے جواب میں جو خط لکھا، اس میں جس شفقت آمیز لہجہ میں ان کو صبر کی تلقین کی، وہ خط ان کی زندگی کی قیمتی متاع ہے، اس میں ''عزیزم'' کا محبت بھرا خطاب بھی ہے، جوان کے بقول بہت کم کسی کے نصیب میں ہے۔

موصوف دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۶۲ھ سے لے کر ۱۳۶۷ھ تک درجۂ فارسی کے مدرس رہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اسی عرصہ میں مدرسِ عربی مقرر ہوئے تھے، جن کے پاس دورۂ حدیث تک کے اسباق تھے، فہرستِ مذکور کی کئی نامور شخصیات بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہیں، ''مدرس درجۂ فارسی'' اور ''مدرس عربی'' دارالعلوم کی اپنی خاص اصطلاحات ہیں، درجۂ فارسی میں مثنوی، سکندر نامہ وغیرہ پڑھاتے رہے، کئی شخصیات ان کے شاگردوں کی فہرست میں آتی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور حضرت شیخ الاسلامؒ سے جو تعلقِ خاطر تھا، اس قربت کے پیش نظر کبھی جدائی کا خیال نہیں آسکتا، حضرت کی خدمت میں رہتے، حضرت ہی نے شادی کرائی، تقریب میں شریک رہے؛ بلکہ اخراجات تک کا بندوبست کیا، لیکن بعض اضطراری حالات کی بناپر اس جدائی کو برداشت کرنا پڑا، تقسیمِ ہند کے بعد پہلے اپنے چھوٹے بھائی مفتی اکمل صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو ساتھ لے کر ہمشیرہ صاحبہ کو پاکستان چھوڑنے آئے، اس کے بعد واپس چلے گئے، پھر ان کی بیماری کی خبر آئی، چونکہ، بچپن میں والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تھا، ہمشیرہ سے تعلق ماں جیسا تھا؛ اس لیے ان کے پاس آگئے، اس وقت تک بغیر پرمٹ آمد ورفت ہوا کرتی تھی، دوبارہ پاکستان آنے کے بعد پرمٹ کا سلسلہ شروع ہوا، حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب ''انفع'' رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح موصوف کے لیے بھی دوبارہ بآسانی جانے کے راستے تقریباً مسدود ہوگئے؛ اس کی وجہ سے

چارونا چار دیوبند اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی حسرتیں دل ہی دل میں رکھ کر یہیں کے ہو رہے، ان دنوں نقلِ مکانی کے دوران دونوں طرف نہایت خون خرابہ ہوا تھا، حضرت سے خاص تعلقِ خاطر، ان کی شفقت الگ سے تھی، اپنی خاص مجلسوں میں نہایت درد بھرے لہجے میں ان کے لیے دعا کی۔

نقلِ مکانی کے بعد ذوق ومزاج کے برخلاف نئے ماحول کی زندگی میں کئی نشیب وفراز آئے، اپنوں اور پرایوں کو دیکھا پرکھا، شغل ومصروفیت کے کئی سلسلوں سے وابستگی کا خیال باندھا، دارالتصنیف حب ریوررروڈ سے منسلک رہے، حضرت علامہ بنوری رحمہ اللہ تعالی نے بینات میں کام کرنے کو کہا، بعض جگہ درسِ حدیث کی بھی بات چلی؛ مگر بوجوہ ایسا نہ ہوسکا، علمی مصروفیت کا کوئی ایک جلی عنوان قائم نہ ہوسکا، ویسے بھی ہم لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ استفادہ کے لیے تو مسندوں کو تلاش کرتے ہیں، مگر مسندوں کے لیے شخصیات کو ڈھونڈ نکالنا، گویا کسی ابھری ہوئی شخصیت سے اغماض برتنا خیال کرتے ہیں، خود دارالعلوم دیوبند میں چوٹی کے اساتذہ حضرت کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت مہدی حسن صاحبؒ وغیرہم کا انتخاب رسمی تکمیل کے کئی سال بعد ہوا تھا، اور اصحابِ مسند مشائخ نے ہی بلا کر کیا تھا۔

صحافت حضرت کا خاص موضوع رہا ہے، کلکتہ میں مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کی سرپرستی میں ''البلاغ'' میں کام کرتے رہے، ان کی غیرتِ ایمانی اور جذبۂ جہاد کا ذکر فرماتے ہیں، مولانا آزاد صاحبؒ سے صحبتیں رہیں، ان کا انٹرویو لیا تھا، الجمعیت دہلی میں بھی لکھتے رہے، جمعیت علماء ہند سے تعلق تھا، تحریکِ آزادی میں حصہ لیا، جیل بھی جانا پڑا، لیگ وکانگریس کے داخلی معاملات سے بھی خوب واقفیت رہی، بایں ہمہ حضرت تھانویؒ، حضرت سلیمان ندویؒ، حضرت شیخ الاسلام عثمانیؒ، وغیرہم حضرات کی صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوئے، دوسری طرف کے بزرگوں میں تو گویا وہ جی رہے تھے، اور انہی کا ذوق ومزاج پایا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے سیاسی مسلک کے حوالے سے ان کی معلومات اس وقت سند کا درجہ رکھتی ہیں، وہ ایک مکمل ڈائری ہیں، سفر وحضر کے اتنے قریب سے دیکھے، سنے ہوئے واقعات، حالات کے بارے میں بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ اور جمعیت علماء ہند کے دیگر اکابر واصاغر کے ذوق ومزاج، طرز وطریقۂ کار کو سمجھنے والے کم ازکم پاکستان میں باستثناء حضرت مولانا مجاہد خان صاحب دامت برکاتہم شاید اب کوئی نہ ہو، ماضی میں دارالعلوم دیوبند بالخصوص شیخ الاسلام اور جمعیت علماء ہند کے دوسرے اکابر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، یا حال میں ڈائریاں مرتب

ہوئی ہیں، ان کے بارے میں اِن ''قدماء'' کے مختصر جملے، محتاط آراء نہایت بالغ نظری کا نمونہ ہوتی ہیں، جن میں اختصار واجمال کے باوجود تاریخی جرح وتعدیل کا مزاج رکھنے والے محققین کے لیے نہایت اہمیت کے حامل اشارے ہوا کرتے ہیں، کئی باتوں کی کڑیاں مل جاتی ہیں، لکھنے والوں کی قدکاٹ کا اندازہ ہوجاتا ہے اور واقعات وحالات کے نئے نئے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

امیر الہند حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب بن حضرت مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب رحمہما اللہ تعالی بجنوری، مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی بن حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمہما اللہ تعالی، امیر شریعت بہار اور حضرت مولانا محمد اصلح صاحب الحسینی دامت برکاتہم تینوں حضرات کا سن ولادت (۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء) ایک ہونے کے علاوہ فراغت کی تاریخ (۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۲ء) بھی ایک ہے، چند مہینوں کے فرق کے ساتھ مؤخر الذکر بڑے بھی ہیں اور طویل العمر بھی، ان بزرگوں میں خوب محبت، تعلق کا رشتہ قائم رہا، خود فرماتے ہیں، مولانا مرغوب الرحمان صاحبؒ سے کبھی نوک جھونک ہوتی تو میں کہتا: میں تم سے عمر میں بڑا ہوں؛ کیونکہ میری پیدائش محرم میں ہوئی ہے، تمہاری بعد میں، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کا انتقال ۳، رمضان ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹، مارچ ۱۹۹۱ء کو ہوا، ان دو حضرات کی جوڑی باقی رہی، حضرت مولانا مرغوب الرحمان صاحب رحمہ اللہ تعالی کی وفات یکم محرم الحرام، بدھ کے روز ہوئی، منگل کے روز ۷ر دسمبر کو ان کے صاحبزادے مولانا محبوب الرحمان صاحب سے فون پر بات ہوئی، موصوف اس وقت اپنے وطن بجنور میں والدِ گرامی قدر کی خدمت میں حاضر تھے، دونوں ساتھیوں نے ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کی اور دعاؤں کے لیے ملتجی ہوئے، یہ گفتگو آخری ثابت ہوئی۔

حضرت والا گلشن اقبال، کراچی میں برخوردار محترم جناب سید طہ صاحب کے ساتھ رہائش پذیر ہیں، تفصیلی حالات ہنوز مرتب ہونا باقی ہیں، حضرت مفتی مظہر اسعدی صاحب (بھاولپور) اور دیگر کئی حضرات کی ان سے ملاقاتیں ہیں، یہ سب معلومات جمع ہونے کے بعد تنقیح وترتیب دے کر سوانحی خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے، جس کے لیے قارئین سے معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ دعاؤں کی بھی درخواست ہے، کہ اس کی توفیق کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرسکتا، اللہ کرے کہ ہمیں اِن بزرگوں کی برکات، علوم ومعارف سے بیش از بیش مستفید ہونے کی توفیق عنائیت ہو اور تادیر اِن حضرات کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے، اللھم آمین!

غلاموں سے متعلق اسلام کے رہنما احکام

(۲)

از: ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی
شعبۂ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسلام نے غلاموں کے حق کو بھی تسلیم کیا ہے

اسلام نے غلامی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے غلاموں کے حق کو بھی تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتا ہو کہ خود سے آزادی حاصل کر سکے تو اسے آزاد کرنے میں کوئی بندش یا قید نہ لگائی جائے؛ البتہ غلاموں پر یہ شرط عائد کی جس بات پر آقا کی رضامندی ہو جائے اسے پورا کیا جائے اور آقا کو بھی چاہیے کہ اس کی آزادی کے تعلق سے جو بات طے پا جائے، اس پر ثابت قدم رہے، اس کی مختلف شکلیں تھیں، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

مکاتب

غلام کو آزادی حاصل کرنے کے لیے اسلام نے ایک طریقہ 'مکاتبت' کا تجویز کیا ہے، یعنی ایک معاہدہ کے تحت غلام اپنے آقا سے کہے کہ میں اتنی رقم ادا کردوں گا، اس کے عوض مجھے آزاد کر دیا جائے، یا اس کی آزادی کے بارے میں ایسی ہی بات آقا اپنے غلام سے کہے، اگر بات طے پا جاتی ہے اور غلام متعینہ رقم ادا کر دیتا ہے تو غلام آزاد ہو جائے گا، رقم کی ادائیگی میں زیادہ سختی بھی نہ ہونی چاہیے، اسی طرح غلام کی بات کو بھی آقا ماننے سے انکار نہیں کر سکتا، غلام طے شدہ رقم اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرے یا اس کے لیے کسی کا تعاون حاصل کرے، اس سے مالک کو کوئی مطلب نہیں، قرآن کریم میں غلام کے اس حق کو بڑے ہی واضح انداز میں تسلیم کیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْراً

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِیَ آتَاکُم.“(النور:۳۳)

(اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں، ان سے مکاتبت کرلو، اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے اندر بھلائی ہے اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔)

مکاتبت کے بارے میں فقہائے اسلام کا اختلاف ہے کہ آقا کا مکاتبت پر راضی ہونا واجب ہے یا مستحب، فقہا کے ایک طبقہ نے آیت کے الفاظ کاتبوھم سے دلیل اخذ کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس لیے یہ واجب ہے۔ دوسرے فقہا کہتے ہیں آیت میں فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا کہا گیا ہے، یہ بھلائی پانے کی شرط ایسی ہے، جس کا انحصار مالک کی رائے پر ہے، جو استحباب پر دلالت کرتا ہے۔(۴۱) چوں کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی پر مختلف پیرائے سے زور دیا ہے؛ اس لیے اسے واجب کے درجے میں رکھنا درست معلوم ہوتا ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے اور اسلام نے حکومت پر بھی یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ جب تم کسی غلام کے اندر بھلائی دیکھو اور اس کی آزادی پر اطمینان ہو اور غلام اس لائق نہ ہو کہ وہ بدلِ کتابت ادا کرسکے تو ضروری ہے کہ اس کی الگ سے مدد کی جائے اور زکوٰۃ وصدقات کی رقم بھی اسے دی جائے؛ تاکہ وہ مکاتبت کی رقم ادا کرکے آزادی حاصل کرسکے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاء وَالْمَسَاکِینِ وَالْعَامِلِینَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِینَ وَفِی سَبِیلِ اللّهِ وَابْنِ السَّبِیلِ.“(التوبہ:۶۰)

(یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

”وَآتَی الْمَالَ عَلَی حُبِّهِ ذَوِی الْقُرْبَی وَالْیَتَامَی وَالْمَسَاکِینَ وَابْنَ السَّبِیلِ وَالسَّآئِلِینَ وَفِی الرِّقَابِ.“ (البقرہ:۱۷۷)

(اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔)

مدبّر

اگر کوئی اپنے غلام سے کہے کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے، یا اسی مفہوم کو ادا کرنے والا اس نے کوئی دوسرا جملہ کہا تو اس کے انتقال کے بعد فوراً ہی غلام آزاد ہوجائے گا۔ آقا اُسے نہ تو فروخت کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو ہبہ کرسکتا ہے، درمیان میں آقا اپنی بات سے پھرنا چاہے تو اس کی بات قابل قبول نہ ہوگی، اگر کوئی اس میں رخنہ ڈالتا ہے تو غلام عدالت سے رجوع کرے گا اور عدالت اسے آزادی دلوائے گی، اسی طرح آقا نے غلام کے کسی ایک حصہ کو 'مدبر' کیا تو بھی وہ کل شمار کیا جائے اور اس کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہوجائے گا، اسی طرح ایک غلام جو مختلف لوگوں میں مشترک ہے، اگر اس میں سے کسی نے اپنا حصہ معاف کردیا تو اب کل غلام آزاد سمجھا جائے گا۔(۴۲) اب وہ اس آدمی کی ذمہ داری ہے کہ بقیہ لوگوں کے حصے کا معاوضہ ادا کرے۔(۴۳)

امّ ولد

اگر باندی سے آقا نے مجامعت کی اور اسے حمل ٹھہر گیا، یہاں تک کہ اس نے صحیح سالم تندرست یا کم زور بچہ جنا، یا اس کا اسقاط ہوگیا یا اس نے مردہ بچہ کو جنا تو وہ آقا کے انتقال کے بعد آزاد ہوجائے گی اور بچہ آقا کا ہی شمار کیا جائے گا اور اگر بچہ زندہ رہا تو اپنے والد کا وارث ہوگا، اب مالک نہ تو باندی کو فروخت کرسکتا ہے اور نہ ہبہ، خلفائے اربعہ کے عہد میں بھی اس پر بہ کثرت عمل ہوتا تھا؛ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

''امہاتِ ولد کی بیع نہیں کی جائے گی، نہ انھیں فروخت کیا جائے گا اور نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ وراثت میں بانٹا جائے گا۔ آقا جب تک زندہ رہے، ام ولد سے تمتع کرتا رہے اور جب مرجائے تو وہ آزاد ہے۔''(۴۴)

باندی سے اس کے بچہ کو بھی الگ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

''جو ماں اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کرائے گا، قیامت کے دن اللہ اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔''(۴۵)

کچھ لوگ اپنی باندی سے مجامعت تو کرتے تھے، مگر اس خوف سے عزل کرلیتے تھے کہ اگر اسے حمل ٹھہر گیا اور اس سے بچہ پیدا ہوگیا تو وہ آزاد ہوجائے گی، ایسا کرنے کو اللہ کے رسولؐ نے

پسند نہیں فرمایا۔(۴۶) کیوں کہ اس سے اس کا حق آزادی سلب ہوتا ہے۔

غلاموں کے قتل پر قصاص

اگر کسی نے کسی غلام کا ناحق قتل کر دیا تو اسلام کی نگاہ میں ایسا شخص بھی مجرم ہے، اس جرم کی پاداش میں اس سے قصاص لیا جائے گا۔ جس نے جیسا ظلم اپنے غلاموں کے ساتھ کیا ہے، اسی کے مطابق اس کو سزا دی جائے گی، قرآن کریم میں قصاص سے متعلق آیتوں میں حکم عام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آزاد کے قتل پر قصاص کے طور پر قاتل کو قتل کیا جائے گا، اسی طرح غلام کے قتل پر بھی قاتل کو قتل کیا جائے گا؛ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاص." (المائدہ:۴۵)

(توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا درجہ ہے۔)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ." (البقرہ:۱۷۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے، آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا اور غلام ہے تو غلام ہی کو قتل کیا جائے گا۔)

حدیثِ رسولؐ میں بھی یہ حکم صراحت کے ساتھ موجود ہے، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

''جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اس کو قتل کریں گے اور جو اپنے غلام کی ناک کاٹے گا ہم اس کی ناک کاٹیں گے۔''(۴۷)

جتنا ظلم غلام کے ساتھ کیا گیا ہے، اتنا ہی مواخذہ اس سے کیا جائے گا، ایک حدیث سے اس کی بہ خوبی وضاحت ہوتی ہے:

''جس نے اپنے غلام کو خصی کیا ہم اس کو خصی کریں گے۔''(۴۸)

اسی بنا پر فقہائے احناف کہتے ہیں کہ حر کو عبد کے بدلے میں اور عبد کو حر کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔(۴۹)

ظلم وزیادتی جہاں سے سرزد ہوئی ہے، اس کی سزا اسے ملنے ہی چاہیے، کسی کے ساتھ امتیازی سلوک اسلام میں جائز نہیں ہے۔

بغیر تحدید کے آقا باندی سے استمتاع کرسکتا ہے

اسلام نے بیویوں کی تعداد میں تحدید کردی ہے کہ کوئی بھی مسلمان بیک وقت چار بیویوں سے زیادہ اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا، اس کے برعکس باندیوں کے رکھنے اور اس سے استمتاع کرنے کے سلسلے میں کوئی تحدید نہیں رکھی ہے، یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، جس کا ڈھنڈھورا پیٹا جاتا ہے، یہ آزادی اسلام کی مصلحت پر مبنی ہے، ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ قیدیوں کی تعداد ایک دو نہیں سیکڑوں اور ہزاروں میں ہوتی ہے، ان میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد بھی خاصی ہوتی ہے، اسلام انھیں یک لخت قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا، بہ شکل مجبوری اسلام انھیں لوگوں میں بانٹ دیتا ہے؛ تاکہ ان کی پرورش وپرداخت بھی ہوتی رہے اور دشمن کا غرور بھی ٹوٹے، اب غور کیا جائے کہ لونڈیوں کے رکھنے یا اس سے تمتع حاصل کرنے کی تحدید کردی جاتی تو باقی لونڈیوں کا حال کیا ہوتا، وہ بھی انسان ہیں، ان کے بھی جذبات وخواہشات ہیں، ان کی تکمیل کے لیے وہ اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتیں، اس سے معاشرہ میں مزید برائی پھیلتی؛ اس لیے اسلام نے معاشرہ کو پاک وصاف رکھنے کے لیے صرف ان کے مالکوں کو ہی حکم دیا کہ ان سے چاہو تو تمتع کرو، یا انھیں آزاد کرکے اپنے نکاح میں رکھ لو، یا پھر ان کی شادی کسی دوسری جگہ کردو، اس طرح ان کی اچھے طریقے سے کفالت بھی ہوجائے گی اور برائی پھیلنے کا جو خدشہ ہے اس کا بھی انسداد ہوجائے گا۔

مالکہ اپنے غلام سے تمتع نہیں کرسکتی ہے

معاندینِ اسلام غلامی کے تعلق سے ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ آقا اپنی باندی سے تمتع کا حق رکھتا ہے، تو پھر مالکہ اپنے غلام سے تمتع کیوں نہیں کرسکتی، یہ سراسر ناانصافی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مرد کی بہ نسبت عورتوں میں عزتِ نفس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے؛ اس لیے مردوں کی بہ نسبت عورتیں کم برائی میں ملوث پائی جاتی ہیں اور پھر اس سے کوئی لغزش یا برائی ہوجاتی ہے تو اس کو

بہت زیادہ ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے، اس کے منفی اثرات آگے چل کر اور بھی بھیانک ہوتے ہیں، گویا کہ وہ اپنے گھر اور خان دان والوں کے لیے ناسور بن جاتی ہے، ایسی صورت میں اسلام عورتوں کو اپنے غلام سے تعلق قائم کرنے کی اجازت دے دیتا تو معاشرہ میں عورتوں کا مقام گھٹ جاتا اور اگر بالفرض اسے نکاح کی ضرورت پڑتی تو یہ ایک اہم مسئلہ بن کر سامنے آتا؛ کیوں کہ کفو کا فرق ہوجاتا اور خود اس کے اقدام کو اس کے گھر والے اور قریبی رشتہ دار قبول نہیں کرسکتے تھے، اس کے برعکس غلام کی آزادی کے بعد ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اس کی اجازت دے دی جاتی تو خان دان کا شیرازہ بکھر جاتا؛ کیوں کہ مرد کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے، بہ قول سید ابوالاعلیٰ مودودی: اپنے غلام سے کسی عورت کا تعلق شہوت رانی کی غرض تو پوری کرسکتا ہے، مگر اسلامی نظامِ تمدن کے اندر ان دوسری اغراض کو پورا نہیں کرسکتا، جن کو شریعت نے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتا ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں مرد غلام ہونے کی حیثیت سے عورت کا تابع فرمان ہوگا اور اسے گھر میں وہ اقتدار حاصل نہ ہوسکے گا جو اخلاق ومعاملات کی نگرانی کے لیے اور خان دانی نظام کو درست رکھنے کے لیے مرد ہونے کی حیثیت اسے حاصل ہونا چاہیے۔(۵۰)

اسلام نے غلامی پر اصرار نہیں کیا ہے

اسلام کی شان دار تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے غلامی پر کبھی اصرار نہیں کیا ہے اور جنگی قیدیوں کو 'دائم الحبس' (ہمیشہ ہمیش کے لیے قید) کرنے یا ان کا سر قلم کرنے سے بھی منع کیا ہے؛ بلکہ حتی الامکان اس کی آزادی اور رہائی پر ہی زور دیا ہے، وہ کسی طرح سے بھی آزادی حاصل کرنے میں ناکام ہوتب ہی اسے غلام بنایا جائے، قید کے دنوں میں یا غلام بنانے کی صورت میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی اور نہ انھیں کسی طرح کی اذیت اور تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنایا گیا؛ بلکہ اس کے بجائے ان کی کھوئی ہوئی آزادی بہ حال کرنے کی راہ نکالی گئی اور اس کے لیے شرط یہ رکھی گئی کہ وہ آزادی کے بعد اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں، چنانچہ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جو مسلمانوں کی قید میں آنے سے قبل کئی نسلوں سے غلام در غلام چلے آرہے تھے، یہ لوگ غلاموں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کو ایرانی اور رومی سلطنتیں دوسرے ملکوں سے پکڑ لاتی تھیں اور پھر انھیں

مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے محاذِ جنگ پر بھیج دیتی تھی۔(۵۱)

اسلام نے غلامی کو بالکل ختم کیوں نہیں کیا؟

اسلام نے جاہلیت کے مذموم عناصر کو کالعدم کردیا اور اس کی جگہ نیا اور آفاقی ضابطۂ حیات نافذ کردیا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے جاہلیت کی اس غیر منصفانہ روش کو اولِ وہلہ میں ہی کیوں نہ ختم کردیا اور ایک نیا ضابطہ ''آج کے بعد سے کوئی غلام نہیں بنایا جائے گا اور اس وقت جو غلام کسی کی ملکیت میں ہیں سب آزاد ہیں'' کیوں نہیں نافذ کردیا، اگر بہ غور دیکھا جائے تو یہ بات بہ خوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلام نے بالکل ابتدائی دنوں میں ہی اس لعنت کو ختم کردیا، مگر چوں کہ حالات ایسے تھے کہ اس کا نفاذ اتنی جلد ممکن نہ تھا، دراصل غلامی انسانیت کے جسم پر ایک پھوڑا تھا۔ اس کو دور کرنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے تھے، یا تو ایک جراح کی طرح چاقو سے اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے، یا اندرونی تنقیہ سے تحلیل کرکے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جائے، اسلام نے دونوں ہی طریقے استعمال کیے، لیکن دوسرے طریقے کی طرف زیادہ توجہ دی، یعنی لوگوں کے دل میں غلامی کے خلاف جذبہ پیدا کیا، غلامی کا رواج اس زمانے کی معاشیات سے بھی اس طرح وابستہ تھا کہ کسی فوری حکم سے ایک دم اس کو ختم نہیں کیا جاسکتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ لاکھوں انسان جو اپنے آقاؤں کے رحم وکرم پر پل رہے تھے قوم کی حیاتِ اجتماعی پر ایک ہولناک بوجھ بن کر رہ جاتے اور معاشی نظام کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگتا؛ اس لیے اگر ایک بے صبرے طبیب کی طرح جلد بازی کے ساتھ اس پھوڑے کو کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی جاتی تو بیمار انسانیت کی جان کے لالے پڑجاتے، اس کے علاوہ فی الفور ایسا کرنے میں خود اسلام کو جو خطرہ درپیش ہوسکتا تھا وہ اس پھوڑے کے کاٹنے سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا۔(۵۲) چنانچہ اسلام نے اس کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا جب تک حالات مکمل خاتمے کے لیے سازگار نہ ہوگئے اور ساری دنیا کے لوگ جنگی قیدیوں کے متعلق ایک مشترکہ لائحۂ عمل پر متفق نہ ہوگئے۔(۵۳)

اسلام نے غلاموں کو سماج کا معزز فرد بنادیا

اسلام نے غلاموں کے جو حقوق متعین کیے، اس کے نتیجے میں سماج کے اس مظلوم طبقہ نے اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور اپنے آقا کی شفقت وتوجہ سے سماج میں بڑا اونچا

مقام حاصل کیا، اس کی صلاحیتوں اور خدمات کو لوگوں نے نہ صرف سراہا؛ بلکہ ان سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، ان کے سامنے علم و ہنر کے حصول کے لیے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کی امامت میں نمازیں ادا کیں، شرعی معاملات میں ان کے فیصلے کو تسلیم کیا، جنگوں میں ان کے جھنڈے تلے ملکوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ انہوں نے حکومت وسیادت بھی کی، انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو غلاموں کی خدمات اور ان کے فیوض سے محروم رہا ہو، ایسے ہنرمند اور باصلاحیت غلاموں کی بڑی تعداد ہے، ان میں بہت سے صحابہؓ بھی ہیں تو بڑی تعداد میں تابعی اور تبع تابعی بھی، بہت سے محدث ہیں تو اچھے خاصے مفسرین بھی ہیں؛ اسی طرح علماء وفقہا کی فہرست میں یہ بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔(۵۴) گویا کہ اسلام نے آزاد اور غلام میں کوئی فرق ہی نہ رہنے دیا۔

سماج کا یہ مظلوم اور مقہور طبقہ شروع شروع میں یقیناً احساسِ کمتری کا شکار رہا؛ مگر جیسے ہی نبی اکرم ﷺ کی نگاہِ رحمت وشفقت پڑی تو یہ ذلت بھری زندگی سے بہ تدریج نکلتے چلے گئے، آپؐ نے اپنے غلام زید بن حارثہؓ کے ہاتھوں میں بعض جنگوں کی قیادت سونپی، ان کے بیٹے اسامہ بن زید کو اپنی گود میں کھلایا اور ان کی پرورش وپرداخت میں حددرجہ تعاون کیا، بلال حبشیؓ کو موذنِ رسول کا خطاب ملا، سلمان فارسی، صہیب رومی، سالم مولی اور دوسرے بہت سے غلام صحابہؓ کی آپؐ نے جو حوصلہ افزائی کی دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، باندیوں کے ساتھ آپ نے حددرجہ لطف ومہربانی کا معاملہ فرمایا، ان کی عزت وعصمت کو سماج میں محفوظ کیا، اب کوئی اسے روپے کمانے کی مشین نہیں بنا سکتا اور نہ کوئی ان پر نگاہِ بد ڈال سکتا ہے، قرآن، حدیث اور فقہ کی کتابوں کا بہ غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات مزید واضح ہوجاتی ہے، اسلام نے کتنی دیانت داری اور انصاف کو ملحوظ رکھ کر ان کے حقوق کو متعین کیا ہے، بہ قول سید امیر علی:

> ''اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیرِ اعظم ہوتا ہے، وہ کسی چہ می گوئیوں کے بغیر اپنے آقا کی بیٹی سے شادی کرسکتا ہے اور خان دان کا سربراہ بن سکتا ہے، غلاموں نے سلطنتوں پر حکومت کی ہے اور شاہی خان دانوں کی بنا ڈالی ہے، محمود غزنوی غلام زادہ تھا.... قطب الدین ایبک دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ اور اس اعتبار سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اصلی بانی ایک غلام تھا، اسلام میں جس غلامی کی اجازت تھی، وہ اس غلامی سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی جو کل تک دنیائے عیسائیت میں رائج تھی یا امریکہ میں ۱۹۶۵ء تک

رائج تھی، جب کہ ایک مذہبی جنگ نے اس لعنت کا خاتمہ کردیا۔'' (۵۵)

بعض دانش ورانِ مغرب کا اعتراف

اسلام میں غلامی کوئی دائمی چیز نہیں؛ بلکہ یہ عارضی اور مصلحت پر مبنی تھی؛ لیکن اس کے باوجود اس نے غلامی میں جو غیر معمولی اصلاحات کی ہیں وہ قابل تعریف اور سراہنے کے لائق ہیں۔ مغرب چاہے جتنا بھی اسے برا کہے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کردے، وہ کہیں نہ کہیں جاکر اسلام کے نظریۂ غلامی کا اعتراف کرے گا؛ یہی وجہ ہے ہم جب مغرب کے مفکرین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حددرجہ بغض رکھنے کے باوجود وہ اسلام کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بڑی تعداد ہے، ان میں چند مفکرین کے نظریات یہاں قلم بند کیے جاتے ہیں، 'جان ڈنبرگ' لکھتا ہے:

''اسلام میں غلاموں کے لیے بہتیرے قواعد رکھے گئے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محمدؐ اور ان کے پیرو کس قدر شریفانہ انسانی شعور واحساس رکھتے تھے، ان قواعد کا مطالعہ کرنے کے بعد تم دیکھو گے اسلام کی خوبیاں ان تمام طریقوں کے مناقض ہیں جن کو ہمارے زمانہ تک بڑی بڑی مدعیانِ تہذیب وتمدن قومیں اختیار کرتی رہی ہیں؛ ہاں اسلام نے غلامی کے اس رواج کو فنا نہیں کیا جو دنیا میں پھیلا ہوا تھا؛ لیکن اس نے غلام کی حالت بہتر بنانے کی بڑی کوشش کی ہے۔'' (۵۶)

اسلامی غلامی میں کتنا حسن اور کتنا قبح ہے، اس کا مختلف الجہات سے جائزہ لینے کے بعد 'ڈاکٹر مارکس ڈاؤس' جس نتیجہ پر پہنچا، اس کا وہ برملا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''محمدؐ بہت شفیق اور رحم دل شخص تھے اور بلاشبہ آپ کا یہ منشا تھا کہ غلاموں کی حالت میں اصلاح کریں، اگر آپ فی الفور غلامی کی آزادی کا خیال کرتے تب بھی اس کو عمل میں لانا غالباً ناممکن پاتے، لیکن آپ نے 'انما المؤمنون إخوه' کا اعلان کرکے بہ تدریج اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک ایسا یقینی ذریعہ سوچا، جو آپ کے اختیار کے مطابق سب سے بہتر ذریعہ تھا، اس کے ساتھ ہی آپ نے موجودہ غلاموں سے نیک برتاؤ کی ہدایت فرمائی، اس بارہ میں آپ کی آخری نصیحت ایسی اہم اور وقیع ہے کہ اس سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی، آپؐ نے فرمایا: 'اب رہے تمہارے غلام تو دیکھو جو تم کھاتے

ہو وہی ان کو کھلاؤ، جیسا کپڑا تم پہنتے ہو ویسا ہی ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسا قصور کریں جو تم معاف نہیں کر سکتے تو انھیں فروخت کر دو؛ کیوں کہ وہ خدا کے بندے ہیں اور انھیں ایذا نہیں دینی چاہیے، لوگو میری بات سنو! اور اسے خوب سمجھ لو کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم سب مساوی ہو اور تم سب ایک برادری ہو۔' اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی تلقین کردہ انسانی مساوات کی عملی مثالیں تو بعض ممالک میں نظر آتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ عیسائی ملکوں میں اس پر عمل نظر نہیں آتا، حضرت عمرؓ اپنے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے نکلتے ہیں اور ان کا غلام اونٹ پر سوار ہے، پیغمبرِ اسلام کی جگر گوشہ حضرت فاطمہ اپنی باندی کے ساتھ چکی پیستی نظر آتی ہیں، یہ وہ نمونے ہیں جن میں آپ کی تعلیم کی مکمل مثال ملتی ہے۔'' (۵۷)

غلامی کے متعلق مغرب میں ایک عام منفی رجحان پایا جاتا ہے، جو اسلامی غلامی سے بالکل مختلف ہے، اس کے برعکس اسلام غلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے 'موسیو لیبان' لکھتا ہے:

'' غلامی کا لفظ جب اس یورپین شخص کے سامنے بولا جاتا ہے جو امریکن ناولوں اور روایتوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، جن کا سلسلہ تیس سال سے جاری ہے تو اس کے ذہن میں فوراً تصور پیدا ہوتا ہے ان غریبوں کا جو زنجیروں میں بندھے ہوئے ہوں اور ان کو کوڑے برسائے جارہے ہوں اور پھر ان بے چاروں کو بقائے حیات کے لیے کافی غذا نہ ملتی ہو اور رہنے کے لیے انھیں تیرہ وتار کوٹھریاں نصیب ہوئی ہوں، مجھ کو اس سے بحث نہیں کہ یورپ میں جو غلام ہیں ان پر یہ تمام باتیں صادق آتی ہیں یا نہیں؛ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں غلاموں کا جو تصور ہے، وہ عیسائیوں کے غلاموں کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔'' (۵۸)

خلاصۂ بحث

اسلام نے دنیا کے رائج نظام سے ہٹ کر غلاموں کے متعلق اپنی ایک الگ راہ نکالی اور اس میں اتنی لچک اور وسعت پیدا کر دی کہ نام کی تو غلامی باقی رہ گئی؛ مگر ان کے سارے حقوق آزاد انسانوں کے برابر ہو گئے، وہ اپنے آقا کی ماتحتی میں بغیر کسی فکر اور خوف کے زندگی کے شب و روز

گزارتے تھے اوراپنی خدمات سے معاشرہ کے لیے کارگر ثابت ہوتے۔ مالک بھی غلام کی ضرورت اوران کی اہمیت کوسمجھ کران کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے اور غلام بھی انھیں اپنا محسن سمجھ کر ان کی عزت کرتے ،اب نہ توانھیں تاریک کمروں میں بند کیا جاتا اور نہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی جاتی تھیں، وہ جب اور جہاں چاہتے آمدورفت کرسکتے تھے،اگران سے کوئی غلطی ہوجاتی تو تیز اور کڑکتی دھوپ میں پتھروں پرلٹا کرزدوکوب نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ان کی اولاد کوغلام بنایا جاتا تھا اور نہ کوئی ان کی عورتوں پر نگاہ بد ڈال سکتا تھا، غلام بھی مال وجائداد رکھنے اوراس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کے مجاز تھے،کوئی دوسرااس پراپنا حق ہرگزنہیں جتا سکتا تھا، وہ عرب کے معزز گھرانوں میں شادی کرسکتے تھے، وہ بھی کسی دعوت اورتقریب میں شریک ہوسکتے تھے اور وہ بھی اپنے یہاں کسی کومدعوکرسکتے تھے۔تعلیم وتربیت کے مراحل وہ طے کرنا چاہتے تواس سے محروم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی ،اگرکسی نے ان کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی تو وہ اسلامی عدالت سے رجوع کرسکتے تھے اورانصاف حاصل کرسکتے تھے،اگرکوئی غلام بیماری میں مبتلا ہوجاتا تو مالک اوردوسرے لوگ بھی اس کی عیادت کرنے میں ذلت محسوس نہیں کرتے تھے اورتواورخودقرآنِ کریم میں غلاموں کا تذکرہ ملتا ہے؛ یہاں تک کہ حضورؐ نے اپنی پھوپھی زادبہن سے ایک آزادغلام کی شادی کرائی ،کوئی بھی دین اورمذہب اس سے زیادہ اپنے غلام کواورکیا دے سکتا، بہ حیثیت ایک انسان وہ جن چیزوں کا مستحق تھا اسے مل گیا۔باوجوداس کے معاندینِ اسلام اسلامی غلامی پر اعتراضات کرتے اوراس کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں،کتنی بددیانتی کی بات ہے؟جب کہ خودان کارویہ غلاموں کے حق میں بڑاہی اذیت ناک رہاہے،آزادی حاصل کرنے کے بعدبھی انھیں سکون سے رہنےنہیں دیا گیااوران پرطرح طرح کی بندشیں عائدکرکے انھیں اسی مقام پر پہنچادیا گیا،جس سے نجات حاصل کرنے کے لیےانہوں نے آزادی حاصل کی تھی، جیتے جی تو وہ انسانوں کی انسانیت سوزی کے مورد بنتے ہی تھے،مرکربھی ان کےنصیبوں میں ابدی عذاب ہوتا تھا؛ کیوں کہ جس شخص نے خودکشی کی ہووہ ملعون ترین گناہوں میں شمارکیا جاتا تھااوراسے گزبھر زمین کاحق بھی نہ پہنچتا تھا،اتنا بھی بہت تھا کہ آدھی رات کے اندھیرے میں اس کی لاش چوری چھپے کسی ناپاک زمین میں داب دی جاتی تھی اوراس کے سینے میں ایک کھونٹا گاردیا جاتا تھا؛ تاکہ دوسروں کوتنبیہ ہو۔(۵۹)

❁ ❁ ❁

مآخذ مراجع

(۴۱) حافظ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دارالاشاعت، دیوبند، ۲۰۰۲ء، ج:۳، ص:۳۸۱

(۴۲) صحیح البخاری، کتاب الشرکة، باب تقویم الأشیا بین الشرکا بصحة عدل۔ کتاب العتق، باب بیع المدبر

(۴۳) ایضاً۔

(۴۴) موطا امام مالک، کتاب العتق والولاء، باب أمهات الأولاد وجامع القضافي العتاقة.

(۴۵) مسند احمد بن حنبل، ج:۵، ص:۴۱۳-۴۱۴۔ جامع الترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی کراهة التفریق بین السبي

(۴۶) جامع الترمذي، کتاب النکاح، باب ماجاء في العزل.

(۴۷) سنن ابوداؤد، کتاب الدیات، باب من قتل عبده او مثل به ایقاد منه۔ جامع الترمذي، کتاب الدیات، باب ماجاء في الرجل یقتل عبده.

(۴۸) سنن ابوداؤد، کتاب الدیات، باب من قتل عبده او مثل به ایقاد منه۔ سنن نسائي، کتاب القسامة والقودة والدیات، باب القصاص في السن.

(۴۹) ابوبکر احمد بن علی الرازي الجصاص، احکام القرآن، مطبعة البهیة، مصر، ۱۳۴۷ھ، ج:۱، ص:۱۵۷

(۵۰) سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیمات، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ج:۲، ص:۳۷۸

(۵۱) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص:۹۶

(۵۲) ابوسعید بزمی، تاریخ انقلاب عالم، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص:۱۱۵

(۵۳) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص:۸۸-۸۹

(۵۴) تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: مولانا سعید احمد اکبرآبادی، غلامانِ اسلام، ندوۃ المصنّفین، دہلی، ۱۹۴۰ء

(۵۵) روحِ اسلام، ص:۴۱۳

(۵۶) مولانا سعید احمد اکبرآبادی، اسلام میں غلامی کی حقیقت، ندوۃ المصنّفین، دہلی، ص:۲۰۷

(۶۷) ایضاً، ص:۲۱۳-۲۱۴

(۵۸) ایضاً، ص:۲۰۲

(۵۹) روحِ اسلام، ص:۴۲۱

❁ ❁ ❁

وارداتِ دل

از: مولانا سعید احمد سرونج قاسمی

سلام اے عالمِ دیں واقف اسرارِ ربّانی
سلام اے عارفِ علمِ حدیث وعلمِ قرآنی

مُدیرِ محترم ، جامع کتابِ ''بابری مسجد''
کھلا عُقدہ جو دیکھی یہ کتابِ بابری مسجد

جو گذری بابری مسجد مراحل در مراحل سے
لکھا ہے خوب تاریخی شواہد اور دلائل سے

حقائق پر ہے مبنی درحقیقت داستاں ساری
اُجاگر ہوگئی جس سے چھپی وہ داستاں ساری

شکستِ گنبد و در سے ہوا جذبات کا عالم
دکھانے پر تُلی ہے چشمِ نم برسات کا عالم

ابھی تو شاد ہیں دل میں عدالت کی عنایت سے
بہت پچھتائیں گے جب فیصلہ ہوگا بغاوت سے

بغاوت ہم نہیں کرتے نہ حامی ہیں بغاوت کے
عقیدوں کی بناء پر فیصلے ہوں گے بغاوت کے

مگر جب آستھاؤں سے گھرا ہندوستان ہوگا
تو پھر ٹکڑے ہی ٹکڑوں میں بٹا ہندوستاں ہوگا

نہ یہ جمہوریت ہوگی نہ باقی سلطنت ہوگی
جدھر دیکھو اُدھر بس شورشوں کی شیطنت ہوگی

نہ کوئی منتری ہوگا، نہ یہ سنسد بھون ہوگا
الگ ڈکٹیٹری ہوگی، الگ سنسد بھون ہوگا

جو چاہو کہ رہے امن واماں، جمہوریت باقی
تو مل جل کر رہو تا کہ رہے انسانیت باقی

عقیدہ یہ تمہارا ہے عقیدہ یہ ہمارا ہے
عقیدوں پر نہیں لڑتے کہ لڑنے میں خسارا ہے

مقولہ حضرتِ اقبال کا مدِّ نظر رکھو
کہا تھا جو بہت پہلے اُسے پیشِ نظر رکھو

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

❁ ❁ ❁